دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2019ء / صفر المظفر تا ربیع الثانی 1441ھ جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 4 رجسٹرڈ نمبر S-370

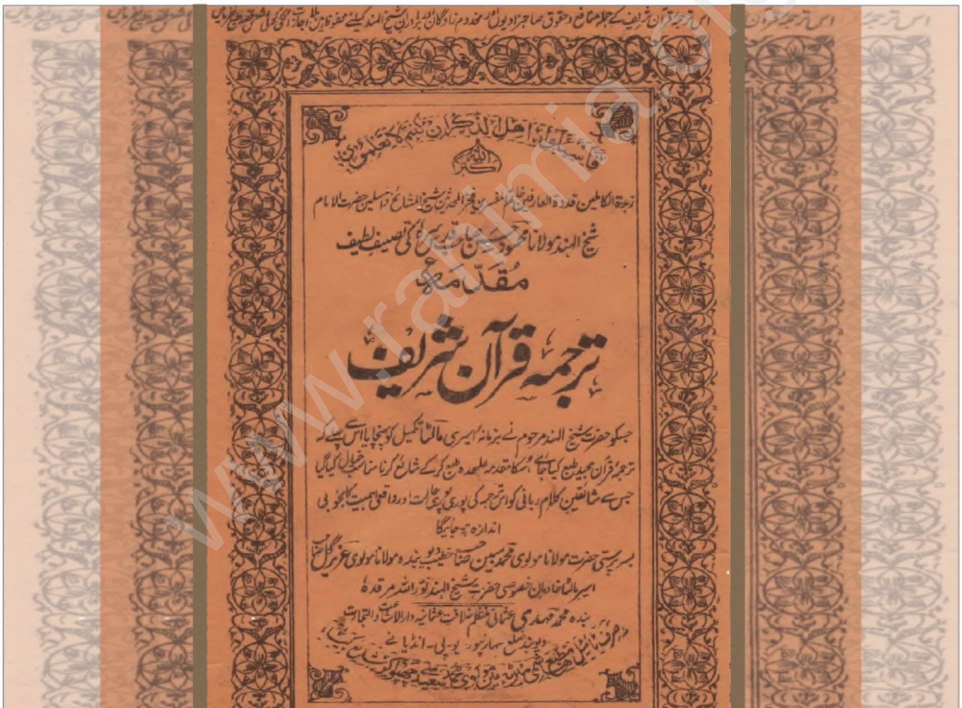

فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون

زبدۃ الکاملین قدوۃ العارفین ... شیخ المشائخ ... حضرت الامام

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی تصنیف لطیف

مقدمہ

ترجمہ قرآن شریف

جسکو حضرت شیخ الہند مرحوم نے بزمانہ اسیری مالٹا تکمیل کو پہنچایا اس سے پہلے کہ
ترجمہ قرآن مجید طبع کیا جائے اسکا مقدمہ علیحدہ طبع کرکے شائع کرنا مناسب خیال کیا گیا
جس سے شائقین کلام ربانی کو اس ترجمہ کی پوری خصوصیات اور واقعی اہمیت کا بخوبی
اندازہ ہو جائیگا

بسرپرستی حضرت مولانا مولوی محمد میین صاحب خطیب دیوبند و مولانا مولوی عزیز گل صاحب
اسیر مالٹا خادمان خصوصی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ

بندہ محمد مہدی عثمانی منتظم خلافت عثمانیہ دار الاشاعت والتجارت
دیوبند ضلع سہارنپور یو-پی- انڈیا نے

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

علم شعور اور حریتِ فکر عطا کرتا ہے

''علم شعور دیتا ہے۔ حریتِ فکر عطا کرتا ہے۔ آزادی سے سوچنے کا موقع دیتا ہے۔ حقائق کا ادراک کرنے اور مسائل کی نشان دہی کا طریقہ سکھاتا ہے۔ جو علم سوچنے سمجھنے کی تخلیقی صلاحیت طالبِ علم میں منتقل نہیں کرتا، وہ علم نہیں ہے۔ علم محض رٹنے کا نام نہیں ہے۔ علم محض نقل یا تبلیغ کا نام نہیں ہے۔ علم کے ذریعے سے اساتذہ اپنے طلبا میں وہ مہارت منتقل کرتے ہیں، جس سے اُن میں تخلیقی اُبھار پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ملک اور قوم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کردار ادا کرسکیں۔

یہ تبھی ہوگا کہ جب اُن کے ذہنوں پر کوئی بھی مسلط کردہ ظلم یا جبر نہ ہو۔ نہ سرمائے کا جبر ہو، نہ جاگیر کا جبر ہو، نہ مذہبی پاپائیت کا جبر ہو۔ نہ کوئی ظلم و زیادتی کا عمل ہو۔ علم اُس کے فکر کو بلند کرے۔ اس میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرے، تقلیدی نہیں۔ تقلیدی صلاحیت تو طوطا بھی سیکھ لیتا ہے، وہ بھی ''میاں مٹھو چوری کھانی ہے'' کہتا ہے۔ وہ بھی ذکر کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ تقلیدی علم ہے۔ اللہ نے انسان ایک ایسی مخلوق بنائی ہے، جس کے بارے میں اس نے کہا: ہم نے اس کو ''احسنِ تقویم'' بنایا ہے، اس کے اندر تخلیقی کام کرنے کی صلاحیت ہے۔

(پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل و تقاضے اور اُسوۂ حسنہ، ص: 63)

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اکتوبر تا دسمبر 2019ء / صفر المظفر تا ربیع الثانی 1441ھ | جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 4 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست	مدیرِ اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
صدر	**مدیر**
مفتی عبدالمتین نعمانی	مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف لاہور ☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی سکھر ☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر چشتیاں ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر جھنگ ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن نوشہرہ ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل سعودی عرب ☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی شکارپور ☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین بہاولپور ☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر لاہور

قیمت فی شمارہ : -/200 روپے | سالانہ زرِتعاون -/800 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) رجسٹرڈ لاہور

RAHIMIA INSTITUTE OF QURANIC SCIENCES (TRUST) LAHORE PAKISTAN

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی''، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

اداریہ	حرفِ اوّل	مدیرِ اعلیٰ	3
مطالعۂ قرآنیات	مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید ''موضحِ فرقانِ حمید'' (اصل متن)	از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ تحقیق وتخریج: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری☆	5
مطالعۂ تراجمِ قرآنیہ	تراجمِ قرآنیہ کا تنقیدی مطالعہ حضرت شیخ الہندؒ کی ایک اہم یادداشت	تحریر: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ترتیب وحواشی: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری	39
علمی لیکچرز	''پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل وتقاضے اور اُسوۂ حسنہ'' خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان	53
بیابہ مجلسِ مشائخ	خانقاہِ رائے پور کی دینی خدمات	تحریر پروفیسر محمد انس حسان☆	93
تاریخ و سیاست	پاکستان کا یومِ آزادی کیا ہے؟ (14 / یا 15 / اگست 1947ء)	تحریر عقیل عباس جعفری☆	113

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسند نشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ پروفیسر محمد انس حسان — گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں۔ پاکستان

☆ عقیل عباس جعفری — سابق مدیر اعلیٰ اُردو لغت بورڈ کراچی

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

قرآن حکیم انسانی سوسائٹی کی دُنیوی اور اُخروی ترقی کے لیے ایک مکمل دستور العمل ہے۔ یہ انسانی سوسائٹی کے لیے ایک ایسا آئین اور آفاقی قانون ہے، جس پر عمل کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی بہترین ڈسپلن کے ساتھ اپنا نظامِ حیات اُستوار کرتی ہے۔ اس کے ذریعے سے انسانی عقل وشعور اتنی بلندی حاصل کرتی ہے کہ وہ اپنی ہمت سے نہ صرف دنیاوی ترقی کی سوچ رکھے، بلکہ موت کے بعد کے مختلف مراحل میں ترقیات کی اُمنگ اور بلند ترین جذبہ بھی پیدا کرے۔ کسی دستور العمل اور آئین کا غلط فہم قومی نظاموں کی تباہی اور بربادی کا سبب بنتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ممالک اور اقوام تنزل کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ سطحی نوعیت کے بیانیے اور غلط فیصلے کر لیتی ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں اور آیات کا پورا مضمون، اس میں مضمر معانی کی نوعیت اور اس کے عملی نتائج و اثرات کا پوری طرح احاطہ کیا جائے۔ ایسا تبھی ممکن ہے کہ قرآن حکیم ایسا عظیم دستور العمل جس زبانِ عربی میں نازل ہوا ہے، اس پر پورا عبور حاصل ہو۔ اس کی صَرف ونحو کا صحیح ادراک ہو، اُس کی بلاغت اور فصاحت کا درست فہم حاصل ہو، اس کی فقہ ومسائل کا پورا درک ہو۔ جس معروض میں وہ نازل ہوا، اس کے ادراک کے ساتھ ساتھ اس کے آفاقی قانونی پہلوؤں اور انسانیت گیر اُمور کی وسعتوں کو بہتر طور پر سمجھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو قرآن حکیم کی نصوص اور الفاظ کا پورا مطلب اور مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور انسان قرآن حکیم کے فہم میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس کی غلط ترجمانی کرتا اور مطلب کچھ سے کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم انسانیت کی فلاح و بہبود کا جو نظام بنانا چاہتا ہے، اس کی حقیقی نوعیت میں بڑا تغیر وتبدل پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی اسی اہمیت کو سامنے رکھ کر علمائے ربانیین نے مختلف زبانوں میں اُس کے صحیح تراجم کیے ہیں۔ قرآن حکیم کے اصل نصوص کو سامنے رکھ کر اُن کا ٹھیک ٹھیک مطلب متعین کیا ہے اور جس زبان میں اُس کا ترجمہ کیا، اُس کے محاوروں، انداز اور اُسلوب کو سامنے رکھ کر قرآنی مطالب اور مفاہیم اور اُس کے قوانین کی وضاحت اور تشریح کی ہے۔ اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ترجمہ نگاری کے بنیادی قوانین اور ضابطے متعین کیے۔ انھوں نے رمضان ۱۱۵۱ھ / دسمبر 1738ء میں فارسی زبان میں کیے گئے اپنے ترجمہ قرآن ''فتح الرحمٰن'' کی تحریر سے پہلے ''المقدّمہ فی قوانین التّرجمہ'' میں انھیں بیان کیا۔ اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ۱۲۰۵ھ / 1791ء میں ''موضحِ قرآن'' کے نام سے اُردو ترجمہ کرتے ہوئے انھی قوانین کو جامعیت کے ساتھ سامنے رکھا۔ کوئی سو سال کے بعد اُردو زبان کی ترقی یافتہ نوعیت اور اُس کے محاوروں کے انداز و اُسلوب کو سامنے رکھ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ولی اللّٰہی اُسلوب، اُن کے بیان کردہ قوانین اور ضابطوں کی روشنی میں

قرآن حکیم کا ایک جامع اور بہترین ترجمہ ۱۳۳۶ھ / 1918ء میں ''موضحِ فرقانِ حمید'' کے نام سے کیا۔

اس ترجمے کی تکمیل پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ایک جامع ''مقدمہ'' بھی تحریر فرمایا۔ اس مقدمے میں انھوں نے گزشتہ سو سال کے اُردو تراجم کا بھی جائزہ لیا اور تحقیق و تنقید کے اُصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی قرار واقعی حیثیت متعین کی۔ بعض ترجمہ نگاروں نے آیاتِ قرآنیہ کے حقیقی معانی اور مفاہیم کو نظر انداز کرتے ہوئے بے موقع ترجمے، مطالب میں خبط، ناقص اور ادھورے فوائد اور جمہور علما کے علی الرغم فقہی مسائل اور مفاہیم بیان کیے تھے، اُن کی نشان دہی کی۔ اور سب سے بہترین ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ''موضحِ قرآن'' کو قرار دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' میں ''موضحِ قرآن'' کی جامعیت، وسعت اور جملہ مفاہیم اور مطالب کی باریک بینی اور آیات کی فقہی اور قانونی حیثیت کی پوری نوعیت واضح کی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقدمہ ترجمہ نگاری کے اُصولوں کی بڑی وضاحت کرتا ہے۔ اور بہت ہی اہم نکات پر مشتمل ہے۔

اس شمارے میں حضرت شیخ الہندؒ کے تحریر کردہ اس مقدمے کا اصل متن تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا تحریر کردہ اصل ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' آج سے تقریباً سو سال پہلے نومبر 1920ء میں الگ کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ساتھ اُن کا تحریر کردہ اصل مقدمہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ساتھ حضرتؒ کے نام سے شائع ہونے والا مقدمہ حضرت شیخ الہندؒ کا لکھا ہوا اصل مقدمہ نہیں ہے، بلکہ اوّلین ناشرین کی طرف سے اشاعت کے حوالے سے کاپی رائٹس کی قانونی مجبوریوں کے پیشِ نظر اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا گیا، جس سے مطالب اور مفاہیم میں تغیر و تبدل اور مقدمے کی قرار واقعی حیثیت بہت متاثر ہوئی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے 2016ء میں ہمارے ایک کرم فرما دوست نے حضرت شیخ الہندؒ کے اصل مطبوعہ ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' کا عکس شائع کیا اور موازنہ کر کے یہ بات واضح کی کہ عام طور پر شائع ہونے والے مقدمے اور اصل مقدمے میں کہاں کہاں کیا فرق ہے اور کیا تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ ہم اس مقدمے کے اصل متن کو تحقیق و تخریج اور حواشی کے ساتھ یہاں شائع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کے مقدمے کا اصل متن ترجمہ نگاری کے بہت سے اصولوں کے حقائق منکشف کرے گا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمۂ قرآن حکیم تحریر کرتے ہوئے اُن تراجم کا بھی تنقیدی جائزہ لیا، جن میں غلط ترجمے تھے اور فوائد میں بڑا نقص اور کمزوری تھی۔ انھوں نے ان ترجموں اور فوائد میں کہیں غلط بیانی، کہیں مسائل میں خلطِ مبحث اور کہیں فوائد سمجھنے میں خبط کی نوعیتیں واضح کیں۔ اس سلسلے کا ایک ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کا ''قرآن مجید مترجم'' ہے۔ اس حوالے سے حضرت شیخ الہندؒ کے مسوداتِ ترجمہ میں ایک اہم یادداشت محفوظ تھی، جسے ترجمہ قرآن حکیم کے اوّلین ناشر مولانا مجید حسنؒ نے ترجمے کی پہلی اشاعت میں شائع کر دیا تھا۔ ہم نے اس یادداشت کی بھی تحقیق و تخریج کی ہے اور متعلقہ جگہوں پر تفصیلی حواشی ترتیب دیے ہیں۔ اس شمارے کا دوسرا مقالہ ''تراجمِ قرآنیہ کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے اسی یادداشت پر مشتمل ہے۔

اس شمارے کا تیسرا مقالہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں دیے گئے ایک لیکچر بعنوان ''پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل و تقاضے اور اُسوۂ حسنہ'' پر مشتمل ہے، جب کہ دیگر مقالات میں ''خانقاہِ رائے پور کی دینی خدمات'' اور ''پاکستان کا یومِ آزادی کیا ہے؟'' شامل ہیں۔ امید ہے قارئین ان مقالات سے اس خطے کے تاریخی حقائق تک رسائی حاصل کر پائیں گے۔ (مدیرِ اعلیٰ)

مطالعۂ قرآنیات

مقدمہ ترجمۂ قرآن مجید ''مُوضحِ فرقانِ حمید''

(اصل متن)

از: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ
تحقیق وتخریج: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

www.rahimia.org

تعارف اور تمہیدی کلمات

از مرتب

(حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ برعظیم پاک و ہند کی وہ انتہائی ذی علم، بلند ہمت اور عظیم مدبرانہ شخصیت ہیں کہ جنھوں نے دینِ اسلام کے تمام شعبوں؛ شریعت، طریقت اور سیاست میں اُمتِ مسلمہ کی رہنمائی فرمائی۔ ان کے پیر و مرشد ثانی حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے اُن کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''مولوی محمود علم کا کٹھلا ہیں''۔ [1] آپؒ نے جہاں شریعت کی تعلیم و تربیت میں علومِ قرآنیہ کے فروغ کے لیے کردار ادا کیا، وہیں تربیت اور تزکیے کے میدان میں آپؒ کا نامِ نامی اسمِ گرامی اپنے عظیم الشان صحبت یافتہ متوسلین اور تلامذہ کی صورت میں ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ برعظیم پاک و ہند کی آزادی و حریت کے حوالے سے آپؒ کی شخصیت آفتابِ نصف النہار کی طرح چمک رہی ہے۔ تحریکِ ریشمی رومال ایسی حریت اور آزادی کی عظیم تحریک کے آپؒ روحِ رواں تھے۔ الغرض! آپؒ کی شخصیت دینِ اسلام کے تمام شعبوں میں فیوض و برکات کی حامل اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایک عظیم نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے اپنے انتہائی قریبی اور محبوب دوست حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کی ایما پر اُردو زبان میں قرآن حکیم کا ایک جامع ترجمہ فرمایا تھا۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ کے سوانح نگار حضرت میاں سیّد اصغر حسینؒ ''حیاتِ شیخ الہندؒ'' میں لکھتے ہیں: ''بعض اہلِ علم کی استدعا اور بہت مصالح سے اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ کی غایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا''۔ [2]

دیوبند کے قیام کے زمانے میں یہ ترجمۂ قرآن حکیم شروع کیا گیا، جو 10 پارے تک مکمل ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ''سورت توبہ'' کا ترجمہ مکمل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''تمّت سورۃ التّوبہ و الحمد للہ۔ ۲۵/ جمادیٰ الثانی ۱۳۳۰ھ (11/ جون 1912ء) دیوبند''۔ (3)

پھر تقریباً پانچ سال کے وقفے کے بعد مالٹا کی قید میں حضرت شیخ الہندؒ نے دوبارہ ترجمہ لکھنا شروع فرمایا اور سورت یونس کے ترجمے کے اختتام پر تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳/ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ (31/ اگست 1917ء) مالطہ فی الاُسر، و الحمد للّٰہ''۔ (4)

چناں چہ مالٹا کی قید کے زمانے میں تقریباً ایک سال میں باقی 20 پاروں کا ترجمہ مکمل ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ ہر سورت کے ترجمے کے آخر میں تاریخ لکھ کر ''فی مالطہ حالۃ الاُسر و الحمد للّٰہ'' یا ''بمالطہ'' کے الفاظ یا صرف ''مالطہ'' تحریر فرماتے ہیں۔ چناں چہ سورت تکاثر، سورت عصر اور سورت ہمزہ کا ترجمہ مکمل فرمانے کے بعد ۳۰/ رمضان ۱۳۳۶ھ کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کے بعد آخری 10 سورتوں — سورت الفیل سے لے کر سورت النّاس — کا ترجمہ کرنے کے بعد ۲/ شوال ۱۳۳۶ھ / 11/ جولائی 1918ء کی تاریخ تحریر فرمائی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس ترجمۂ قرآن مجید کا تاریخی نام ''موضحِ فرقانِ حمید'' رکھا، جیسا کہ مقدمۂ قرآن حکیم میں حضرت شیخ الہندؒ تحریر فرماتے ہیں۔ ترجمے کی تکمیل پر آپؒ نے ایک ''مقدمہ'' تحریر فرمایا، جس میں ولی اللّٰہی اُسلوب پر ترجمۂ قرآن حکیم کی اہمیت خوب واضح کی۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے لیے ''حُجّۃُ اللّٰہ علیٰ العالَمین و لِلعالَمین'' کا عظیم لقب استعمال فرمایا۔ پھر خاص طور پر ان کے صاحب زادے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر دہلوی قدس سرہٗ کے ترجمۂ قرآن حکیم ''موضح القرآن'' کی قرار واقعی حیثیت، وسعت اور ترجمے میں باریک بینی اور اس میں موجود انتہائی علمی تفسیری نکات کی نشان دہی فرمائی۔ اس طرح حضرت شیخ الہندؒ نے اس ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید'' میں ترجمۂ قرآن حکیم کی اہمیت، نوعیت اور ترجمہ نگاری کے اُصول اور ضابطے بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ عصری تقاضوں کے سبب اُردو زبان میں ہونے والے تغیرات و تبدلات اور محاوروں کی نوعیت میں تبدیلی کے پیشِ نظر ''موضح القرآن'' کی ان تمام خصوصیتوں کو سامنے رکھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمۂ قرآن حکیم تحریر فرمایا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید'' مطالعۂ قرآنیات میں بہت علمی اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے، لیکن افسوس کہ ترجمہ نگاری کے حوالے سے تفسیرِ قرآن حکیم کی علمی حیثیت اور اس میں موجود انتہائی دقیق اور علمی نکات کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسی عدمِ توجہی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ تقریباً ایک سو سال سے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ناشرین حضرت شیخ الہندؒ کے نام سے جو مقدمہ عام طور پر شائع کر رہے ہیں، وہ حقیقی اور اصل متن پر مشتمل نہیں ہے۔

خدا بھلا کرے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی دامت برکاتہم العالیہ کا کہ جنھوں نے اس کی اصل حقیقت واضح کی۔ چناں چہ انھوں نے ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کا اصل مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب فرمائی، جس میں انھوں نے اصل ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' کے اوّل ناشر کی طرف سے شائع کردہ مطبوعہ متن کا عکس بھی شائع کیا ہے۔ مولانا راشد کاندھلوی اس کتاب کے ''عرضِ مرتب'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمۂ قرآن مجید کے لیے جو مقدمہ لکھا تھا، وہ شیخ الہندؒ کی حیات میں چھپنے کے لیے چلا گیا تھا۔ شیخؒ کی وفات کے بعد پریس آیا، لیکن یہ اصل مقدمہ، شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ساتھ کبھی شائع نہیں ہوا۔ ترجمے

کے ساتھ جو مقدمہ چھپتا ہے، وہ ایک الگ تالیف ہے۔ اس کو مقدمۂ تالیفِ شیخ الہندؒ سے کسی قدر مناسبت تو ہے، لیکن یہ اشاعت اصل مقدمے سے مقاصد و مطالب اور الفاظ و عبارات دونوں میں خاصی مختلف ہے، مگر ترجمۂ شیخ الہندؒ کے ساتھ شامل یہی مقدمہ، شیخ الہندؒ کی اہم یادگار کے طور پر پڑھا جاتا ہے اور ہر وقت اُس سے کثرت سے رجوع کیا جاتا ہے، مگر جو اصل مقدمہ شیخ الہندؒ کی تالیف ہے، اس کا تذکرہ بھی نہیں آتا۔ اور میری معلومات کی حد تک شیخ الہندؒ پر لکھنے والے علما اور اہلِ قلم نے اس کا شیخ الہندؒ کے علمی آثار و باقیات میں تذکرہ بھی نہیں کیا۔ راقم سطور کو مقدمۂ شیخ الہندؒ کے اصل متن یا اوّلین طباعت کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تو جی چاہا کہ اس نادر سوغات کو اہلِ علم اور قدردانانِ علوم شیخ الہندؒ کی خدمت میں تحفۂ علمیہ کے طور پر پیش کیا جائے۔ زیرِنظر کتاب یا اشاعت اسی خیال کی عملی صورت ہے''۔ (5)

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن ''موضح فرقانِ حمید'' کے ابتدائی ناشرین کی طرف سے اشاعتی حقوق کے حوالے سے پیدا ہونے والی طباعتی کھینچا تانی کے سبب اصل ''مقدمہ'' میں جان بوجھ کر بڑے تغیرات و تبدلات کیے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے اصل مقدمے کے حقوقِ اشاعت ایک ''ناظمِ مطبع'' نے محفوظ کر لیے، جب کہ ترجمہ قرآن حکیم کی اشاعت کے حقوق ایک دوسرے ناشر صاحب نے لے لیے۔ چوں کہ ترجمہ قرآن حکیم شائع کرنے والے ناشر کے پاس مقدمے کے اصل متن کی اشاعت کے حقوق نہیں تھے، اس لیے انھوں نے خود یا کسی اہلِ علم سے حضرت شیخ الہندؒ کے اصل مقدمے میں قانونی مجبوری کے تحت کانٹ چھانٹ کی اور حضرتؒ کے ''مقدمہ'' کا تأثر دے کر شائع کیا جاتا رہا۔ جس سے بہت سی جگہوں پر حضرت شیخ الہندؒ کے اصل ''مقدمہ'' کی حقیقی روح اور واقعی علمی نکات قطعی طور پر نظرانداز ہوئے ہیں۔ چناں چہ مولانا کاندھلوی لکھتے ہیں:

''غور کیجیے تو خیال ہوتا ہے کہ مقدمہ شیخ الہند کی ترمیم و تنسیخ اور ترتیبِ نو کا کام غالباً مدینہ پریس بجنور کے مالک مولوی مجید حسن صاحب نے مدینہ پریس کے کسی ذی علم ملازم سے کرایا ہے اور اس کو ترجمۂ شیخ الہندؒ کے ساتھ شائع کر دیا۔ اس ترمیم و اصلاح کی ایک وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ شیخ الہندؒ کا مقدمہ (طباعت کے حقوق کے اعلان کے ساتھ) کئی سال پہلے (۱۳۳۹ھ/1920ء میں) شائع ہوکر عام ہو چکا تھا۔ ....اس لیے مولوی مجید حسن صاحب قانونی پابندی کی وجہ سے مطبوعہ (اصل) مقدمے کو جوں کا توں ترجمہ شیخ الہندؒ کے ساتھ شامل و شائع نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ مقدمہ چھپے، مگر وہ قانون اور حقِ طباعت کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہے۔ شاید اسی وجہ سے شائع مقدمے کو کثیر ترمیمات اور حذف و اضافہ کے بعد اس طرح مرتب کرا لیا کہ اس کو مقدمہ شیخ الہند بھی کہا جا سکے اور اس کی مقدمے کی پہلی طباعت سے یکسانیت اور کامل ہم آہنگی بھی نہ ہو کہ مدینہ پریس اس کی طباعت پر قانونی گرفت سے آزاد رہے۔ اس لیے ترجمہ شیخ الہندؒ کی تحریر اور بعد کی تمام طباعتوں کے ساتھ مقدمہ شیخ الہندؒ کا ایک نیا ترمیم شدہ متن شائع کر دیا گیا ہے''۔ (6)

مولانا راشد کاندھلوی نے بڑی عرق ریزی سے ترجمہ قرآن حکیم کے ساتھ عام طور پر چھپنے والے مطبوعہ ''مقدمہ'' اور حضرت شیخ الہندؒ کے تحریر کردہ اصل ''مقدمہ'' کے متن میں تغیرات و تبدلات اور کانٹ چھانٹ کی تفصیل سے نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اگر دونوں مقدموں کو سامنے رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں واضح اور بڑا فرق ہے۔ بیسیوں جگہوں پر دونوں کی عبارتیں مختلف ہیں۔ کوئی عبارت، فقرہ یا پیراگراف پہلی طباعت میں موجود

نہیں، کوئی دوسری سے غائب ہے۔ کئی موقعوں پر پوری بحث خاصی مختلف ہوگئی ہے۔ ترتیبِ مباحث و اَلفاظ کا عمومی اختلاف تو جگہ جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے''۔ (7)

اللہ تعالیٰ مولانا راشد کاندھلوی کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے مقدمے کا اصل متن دوبارہ شائع کیا۔ اس اصل متن کی اشاعت حضرت مولانا عزیر گلؒ اسیرِ مالٹا اور حضرت مولانا محمد مبینؒ کی نگرانی اور سرپرستی میں ہوئی تھی۔ چناں چہ اس کے ٹائٹل پر یہ تحریر شائع ہوئی ہے:

''زبدۃ الکاملین، قدوۃ العارفین، خاتم المفسرین، فخر المحدثین، شیخ المشائخ والمسلمین، حضرت الامام، شیخ الہند، مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی تصنیفِ لطیف **''مقدمہ ترجمہ قرآن شریف''** جس کو حضرت شیخ الہند مرحوم نے بہ زمانہ اسیری مالٹا تکمیل کو پہنچایا۔ اس سے پہلے کہ ترجمہ قرآن مجید طبع کیا جائے، اُس کا مقدمہ علاحدہ طبع کر کے شائع کرنا مناسب خیال کیا گیا۔ جس سے شائقین کلام ربانی کو اس ترجمے کی پوری پوری حالت اور واقعی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ ہوجائے گا۔

بہ سرپرستی حضرت مولانا مولوی محمد مبین صاحب خطیب دیوبند و مولانا مولوی عزیر گل صاحب اسیر مالٹا خادمانِ خصوصی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ بندہ محمد مہدی عثمانی، منتظم خلافتِ عثمانیہ دارالاشاعت والتجارت دیوبند ضلع سہارن پور۔ یوپی۔ انڈیا نے صرف ٹائٹل مطبع ہاشمی میرٹھ میں مولوی محمد سعید سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقدمہ اور ترجمہ قرآن مجید کے متعلق جمیع امور کا معاملہ مولانا محمد مبین صاحب خطیب دیوبند اور مولانا عزیر گل صاحب سے کیا جاوے''۔

مقدمے کے اصل متن کی طباعت اور اشاعت کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہوگیا۔ چناں چہ اس اشاعت کے آخر میں یہ تحریر صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ:

''الحمد للہ! کہ رسالہ ہٰذا تمام ہوا، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے حضرتؒ کی حیات میں اس کو طبع کرنا شروع کیا تھا، مگر پورا نہ ہوسکا۔ اور ۱۸؍ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ (30؍نومبر 1920ء) کو آپ اس عالَم کو خیر باد کہہ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ إنّا للّٰہ و إنّا الیہ راجعون۔ محمد عماد الدین انصاری، ناظم مطبعِ قاسمی دیوبند، ضلع سہارن پور''۔

ہم حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہٗ کا دلی طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُن کے ذریعے سے حضرت شیخ الہندؒ کے ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' کا اصل متن ہمارے سامنے آیا۔ اس مقدمے سے قرآنی ترجمہ نگاری سے متعلق بڑے اہم بنیادی حقائق اور اُمور واضح ہوتے ہیں۔ اس لیے قارئینِ شعور و آگہی کے لیے ہم حضرت شیخ الہندؒ کے اصل مقدمے کا متن تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

مقدمے کی اس اشاعت میں ہم نے آیات کی تخریج کردی ہے۔ مضامین کے ذیلی عنوانات قائم کردیے گئے ہیں۔ مشکل جملوں کی وضاحت کی ہے، جنھیں قوسین ( ) میں لکھا گیا ہے، تاکہ اصل متن محفوظ رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جہاں علمی نکات اُٹھائے ہیں، اُن پر حواشی میں گفتگو کی گئی ہے۔ اقتباسات اور تحریر میں کیے گئے اشارات کے حوالہ جات تحریر کردیے گئے ہیں۔ نیز فارسی اشعار اور عربی الفاظ کا قوسین میں ترجمہ بھی کردیا گیا ہے، تاکہ حضرت شیخ الہندؒ کے مطالب اور مفاہیم واضح ہوجائیں۔ بعض فارسی اشعار کے حوالہ جات ہمیں شاعرانہ مزاج رکھنے والے انجینئر وسیم اعجاز صاحب کی وساطت سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے علوم و فیوض سے پوری طرح مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! (مرتب)

www.rahimia.org

مقدمہ ترجمۂ قرآن مجید ''مُوضحِ فرقانِ حمید''

(اصل متن)

از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست
محمد چشم بر راہِ ثنا نیست
(خدائے (عز و جل) ہماری حمدِ باری کے انتظار میں نہیں ہیں
محمد (ﷺ) اپنی شان میں ہماری نعت گوئی کے منتظر نہیں ہیں)

خدا مدح آفرینِ مصطفیٰ بس
محمد حامدِ حمدِ خدا بس
(خدائے عز و جل محمد مصطفیٰ (ﷺ) کی تعریفِ کامل کے لیے کافی ہیں
محمد (ﷺ) خدائے عز و جل کی حمدِ باری کے لیے کافی ہیں)

مناجاتے اگر باید بیاں کرد
بہ بَیتے ہم قناعت مے تواں کرد
(اگر اللہ تعالیٰ کی مناجات بیان کرنا چاہو
تو ایک بَیت (مصرع) پر بھی قناعت کی جاسکتی ہے)

محمد از تُو مے خواہم خدا را
خدایا از تُو عشقِ مصطفیٰؐ را
(اے محمدؐ! آپ کے ذریعے سے میں خدا کو حاصل کرنا چاہتا ہوں
اے خدا! آپ کے ذریعے سے مصطفیٰ (ﷺ) کا عشق چاہتا ہوں)

www.rahimia.org

دِگر لب وا مکن مظہر فضولیست
سخن از حاجت افزوں تر فضولیست
(اے مظہر! اس کے علاوہ لب کشائی کرنا فضول ہے
ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا فضول ہے [8])

اما بعد! بندہ خاطی و جانی (خطا کار و قصوروار) محمود بن مولوی ذوالفقار علی دیوبند ضلع سہارن پور کا رہنے والا — **غفر اللّٰہ سبحانہ و لوالدیہ** — عرض کرتا ہے کہ:

(ترجمۂ قرآن حکیم کے لیے بعض احباب و مخلصین کا اصرار)

بعض احباب و مخلصین نے بندہ سے فرمایا کہ:

''اگر قرآن شریف کا ترجمہ سلیس و مطلب خیز اُردو زبان میں مناسب اور کارآمد اہلِ زمانہ ہو جاوے تو نہایت مفید ہے اور اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ جس کے دیکھنے سے ناظرین کو بہ سہولت نفع پہنچ سکے اور وہ خلل اور لفظی و معنوی اَغلاط جو آزادی پسند صاحبوں [9] کے ترجمے سے لوگوں میں پھیل رہی ہیں، اُن سے جو کوئی بچنا چاہے تو آسانی سے بچ سکے۔''

اس عاجز نے اپنی بے بضاعتی کے علاوہ عرض کیا کہ:

(۱) اوّل تو مقدسین اکابر کے فارسی اُردو کے تراجم [10] موجود ہیں۔

(۲) ثانیاً علمائے متدیّنین (دین کے سچے پیروکار) کے زمانۂ حال میں متعدد تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں، جو اہلِ اسلام کو نفع پہنچانے اور مذکورہ بالا خرابیوں سے بچانے کے لیے بحمداللہ کافی سے بھی زائد ہیں۔

(۳) من جملہ اُن کے، دو ترجموں کو احقر نے بھی تفصیلی نظر سے دیکھا ہے:

(الف) اوّل مولوی عاشق الٰہی صاحب ساکن میرٹھ کا۔ [11]

(ب) دوسرا مولانا اشرف علی صاحب کا، جو عمدہ اور نافع ہونے کے علاوہ سلف صالحین کے مسلک کے موافق اور مذکورہ بالا خرابیوں سے پاک ہیں۔ [12]

پھر اب کسی جدید ترجمے کی کیا حاجت ہے؟

مگر مخلصین نے اس پر بس نہ کی تو مجبور ہو کر یہ عرض کیا کہ واقعی اس وقت تک کوئی امر ایسا خیال میں نہیں آتا کہ جس کی وجہ سے جدید ترجمے کی ہمت اور جرأت کروں، مگر آپ کے اصرار کی وجہ سے [13] اب احقر تراجمِ معتبرہ قدیمہ و جدیدہ کو غور سے دیکھتا ہے۔ اگر کوئی منفعت اور ضرورت سمجھ میں آ گئی تو اُس کے موافق ان شاء اللہ آپ صاحبوں کے فرمانے کی تعمیل میں سعی کروں گا، ورنہ معذور ہوں گا۔

(ولی اللّٰہی خانوادے کے تراجمِ قرآن کی اہمیت)

اس کے بعد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) اور مولانا شاہ رفیع الدین (دہلویؒ) اور مولانا شاہ عبدالقادر (دہلویؒ) — **قَدَّسَ اللّٰهُ أَسْرَارَهُمْ** — کے تراجم کے مطالعے سے یہ تو خوب دل نشین ہوگیا کہ یہ اکابر مرحومین ہماری ضرورت کو احساس فرما کر، اگر اس کا انتظام نہ فرما جاتے تو آج اس سہولت اور کثرت سے ہم کو تراجم کلامِ الٰہی اچھے سے اچھے اپنی زبان اور اپنے ملک (ہندوستان) میں نظر نہ آتے۔ اور عجب نہ تھا کہ خود ہندوستان جیسے وسیع ملک میں بہت سی زبانیں اور بہت سے اَطراف اور نیز دیگر مما لک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی قومیں اور مشہور اور **ذو الاقتدار** (بڑے اقتدار والی) جماعتیں اس عزت اور نعمت سے خالی یا بہ منزلہ خالی نظر آتی ہیں، ہم بھی آج اُسی نکبت اور نحوست میں مبتلا ہوتے۔ **فجزاهم اللّٰه عنّا أحسن الجزاء و أفضل الجزاء** (پس اللہ تعالیٰ ان کو ہماری طرف سے اچھی جزا اور افضل ترین جزا عطا فرمائے)۔

(ولی اللّٰہی تراجمِ قرآن کے ناقدردانوں کے لیے وعید)

جو محسن کُش ان (ولی اللّٰہی بزرگوں کے) تراجم کی قدر نہ کریں اور اُن میں نکتہ چینی کو اپنے لیے موجبِ فخر و سرخروئی خیال کریں[14]، وہ بے شک ارشادِ (نبویؐ):

''**من لم يشكر النّاس لم يشكر اللّٰه**''.[15]

(جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا)

کے مصداق اور (نبویؐ) پیشین گوئی:

''**لعن آخر هذه الأمّة أوّلها**''[16] **أو كما قال.**

(اس اُمت کا آخری حصہ اپنے پہلے لوگوں پر لعنت بھیجے گا۔)

کے مصدق (کی تصدیق کرنے والے) ہیں۔

و إذا أتتک مذمّتی من ناقص
فهی الشّهادة لی بأنّی کامل[17]

(جب کوئی ناقص آدمی تیرے پاس آکر میری مذمت کرے،
تو یہ اس بات کی گواہی ہے کہ میں کامل آدمی ہوں)

(بامحاورہ ترجمۂ قرآن حکیم کی اہمیت)

اسی کے ساتھ یہ امر بھی اچھی طرح سمجھ میں آ گیا کہ جو لوگ زبانِ عربی سے ناواقف ہیں، اُن کے لیے اگر چہ ترجمہ تحتِ لفظی میں بعض مخصوص فائدے ہیں، جو بامحاورہ ترجمے میں نہیں، مگر ترجمے سے جو بڑی غرض یہ ہے کہ عام اہلِ اسلام ہند کو قرآن شریف کا سمجھنا سہل ہوجاوے، یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہوسکتی ہے، تحتِ لفظی سے ممکن نہیں۔ چناں چہ شاہ عبدالقادر (دہلوی) رحمہ اللہ — جو کہ بامحاورہ اُردو ترجمے کے بانی اور امام ہیں — انھوں نے ترجمہ تحتِ لفظی کے چھوڑنے اور

با محاورہ ترجمے کو اختیار کرنے کی یہی وجہ بیان فرمائی ہے۔ [18]

(حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمے کی اہمیت)

اور یہی وجہ ہے کہ جو اِن کے بعد جس نے اس میدان میں قدم رکھا، اُس نے جناب ممدوح کا اتباع کیا اور با محاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا۔ جس پر کسی کا قول یاد آتا ہے ؎

ہر مرغ کہ پُرزد بہ تمنائے اسیری
اوّل بہ شگوں کرد طوافِ قفسِ ما

(جو پرندہ اپنے پنجرے میں واپس آنے کی تمنا لے کر بلند پروازی کرنا چاہتا ہے
تو اُسے خوش بختی کے لیے سب سے پہلے ہمارے پنجرے کا طواف کرنا ہوتا ہے)

(اس ترجمے کی دو مشکلات)

اسی ذیل میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ با محاورہ میں جو اہلِ زمانِ حال کو دو شکایتیں ہیں، اُن کا حال بھی معلوم ہوگیا کہ وہ شکایتیں بے اصل تو نہیں، ہاں! زمانے کی سہولت پسندی اگر خوردبین کا کام دے رہی ہو تو اُس کے انکار کی بھی حاجت نہیں۔

الحاصل! اس میں شبہ نہیں کہ:

(۱) کہیں کہیں کوئی کلمہ ایسا پایا جاتا ہے کہ زمانۂ حال میں قریب بہ متروک یا متروک شمار ہوتا ہے۔

(۲) اور چوں کہ حضرت ممدوح نے شرائطِ ترجمہ کی رعایت پوری فرمائی ہے اور کلماتِ قرآنی کی لفظاً اور معناً (لفظی اور معنوی طور پر) متابعت (پیروی) اور مطابقت کا برابر لحاظ رکھا ہے تو اس لیے بعض مقامات میں بہ وجہ اختصارِ عبارت' مطلب میں بھی ضرور کسی قدر دِقّت (مشکل) پیش آتی ہے۔

بس یہ دو باتیں ہیں، جن کی وجہ سے ترجمۂ موصوف کی عام نفع رسانی میں کوتاہی اور تنگی محسوس ہو رہی ہے۔

(جدید معتبر تراجمِ قرآن حکیم کی خوبی)

مگر اسی کے ساتھ جب ہم نے تراجمِ جدیدہ معتبرہ پر نظر ڈالی تو اہلِ زمانہ کی دونوں مذکورہ بالا شکایت کی پوری **مکافات** (دور ہونے کی سبیل) ان تراجم میں نظر آئی۔ من جملہ تراجمِ جدیدہ معتبرہ کے (اوپر بیان کردہ) دو ترجمے — جن کو احقر نے تفصیل سے دیکھا ہے — اُن کی تصریح پہلے عرض کر چکا ہوں۔ نہ ان میں **کلمات متروکۃ الاستعمال** (استعمال میں نہ آنے والے الفاظ) ہیں، نہ عبارت میں وہ تنگی۔

الغرض! جو خلل بہ وجہ تغیُّرِ زمان و تبدُّلِ لسان (زمانے کے تغیُّر اور زبان کی تبدیلی کی وجہ سے) پیدا ہوگیا تھا، اُس کا دفعیہ بہ خوبی ہوگیا۔ اور اُسی کے ساتھ جو مفاسد و اَغلاط کہ بعض **غیر مقیَّد** (اصل متنِ قرآن کے الفاظ کی پابندی نہ کرنے والے) اور **قلیلُ الاستعداد** (تھوڑی استعداد والے) صاحبوں کے تراجم سے ظاہر ہوئے تھے، اُن کا بھی کفارہ ہوگیا۔ **فالحمد للّٰہ و جزاھم اللّٰہ** (پس تمام تعریفیں اللہ کی ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کو پورا بدلہ عطا فرمائے)۔

www.ahmia.org

(کسی جدید ترجمے کی ضرورت نہیں ہے)

نظر بریں وجوہ ظاہر ہے کہ اب ہم کو ترجمۂ جدید کی ہرگز حاجت نہیں۔ کیوں کہ مقصودِ اصلی ترجمے سے صرف یہ ہے کہ کلامِ الٰہی کا صحیح مطلب سلف صالحین کے مسلک کے موافق اہلِ اسلام ہند عامۃً (ہندوستان کے مسلمان عام طور پر) بہ سہولت سمجھ سکیں۔ سو تراجمِ موجودہ معتبرہ اس ضرورت کے پورا کرنے کے واسطے کافی وافی ہیں۔

ہم فخر و مسرت کے ساتھ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے معتبرین و متدیّنین علما کی توجہ اور سعی سے تراجمِ صحیحہ مفیدہ قدیمہ و جدیدہ اتنے نظر آتے ہیں کہ ایسے تراجم اور اتنے تراجم ہم کو کسی عجمی زبان میں — باوجود تفتیش — سننے میں بھی نہیں آتے۔ ذٰلک من فضل اللّٰہ علینا (یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے)۔

پھر ایسی حالت میں ہمارا ترجمۂ جدیدہ اُنگلی کٹا کر بلکہ صرف لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے سے زیادہ مفید اور باوقعت نہیں ہوسکتا۔ اور جب ہم خیال کرتے ہیں کہ جدید ترجمہ کرنا گویا در پردہ اور زبانِ حال سے یہ دعویٰ کرنا ہے کہ تراجمِ موجودہ ناکافی ہیں یا کم سے کم ہمارے ترجمے میں کوئی خوبی و منفعت ایسی ہے، جو دیگر تراجم میں نہیں تو جدید ترجمہ کرنا فضول سے بڑھ کر ہمارے لیے ایک شرم ناک امر ہے۔ نعوذ باللّٰہ من شُرور أنفسنا (ہم اپنے نفسوں کے شرور سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)۔

(حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمے کی لطافتیں اور نزاکتیں)

سو اَب بلاکم و کاست اس حالت کا مقتضا یہ ہے کہ ہم ترجمے کے خیال اور فکر سے خالی الذہن اور فارغ البال ہوکر مطمئن ہوجائیں کہ اگر تراجمِ قدیمہ و جدیدہ کی دیکھ بھال اور ان کے موازنے اور پڑتال میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمے کی بہت سی خوبیاں اور لطافتیں اور نزاکتیں اور لفظی اور معنوی ہر طرح کی رعایتیں اتنی محسوس ہوئیں کہ جنھوں نے ترجمۂ مذکور کی وقعت کو بہ درجہا اُس سے زیادہ دل نشین کردیا جو ہمیشہ سے تھی، بلکہ اس کی وجہ سے اُردو زبان کی فصاحت و بلاغت اور وسعت و لطافت اس درجہ ذہن میں آگئی کہ اُردو کی کسی نظم و نثر سے بھی نہ آئی تھی۔ [19]

(اس ترجمے کا قصۂ پارینہ ہونے کا اندیشہ تھا)

پھر جب خیال کیا کہ اس مفید بےنظیر ترجمے سے بہ وجہ ہر دو امر مذکورہ بالا چوں کہ عام طبائع میں بے رغبتی آرہی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ ترجمۂ مذکورہ رفتہ رفتہ تقویمِ پارینہ (بھولی بسری تاریخ) ہوجائے تو نہایت افسوس اور اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر ایک سرسری عذر کی وجہ سے ایک ایسا ذخیرۂ صلاح و فلاح ہمارے ہاتھ سے نکل جائے کہ جس کی مکافات و تدارُک ہماری طاقت سے باہر ہے تو یہ امر ہمارے حق میں کس قدر محرومی اور بدقسمتی کا باعث ہوگا اور عذر بھی وہ، جس میں ترجمے کا کوئی قصور نہیں۔ اگر قصور ہے تو ہماری طلب کا قصور ہے۔ اگر ناظرین غور اور فکر میں بخل نہ کریں اور جہاں دریافت کرنے کی حاجت ہو تو دریافت کرنے سے نہ شرمائیں، نہ گھبرائیں تو بہ سہولت منتفع ہوسکتے ہیں۔ اِنھیں وجوہ سے حضرت ممدوح نے شروع میں لکھ دیا ہے کہ:

''قرآن شریف کے معنی بغیر سندِ اُستاد نہ معلوم ہوتے ہیں، نہ معتبر ہوسکتے ہیں۔'' [20]

علاوہ ازیں یہ دُشواری تو سبھی تراجم میں موجود ہے۔ معلّم (سمجھانے والے اُستاذ) سے کون سا ترجمہ مستغنی کرسکتا ہے۔

حضرت شاہ (عبدالقادر) صاحبؒ کے ترجمے میں کچھ زیادہ سہی۔

(اس مقبول ترجمے کی خدمت اور ضرورت)

الحاصل! اس خیال سے قلق ہوا تو اسی قلق میں یہ بات ذہن میں آئی کہ دو شکایتیں جن کا یہ افسوس ناک نتیجہ نظر آتا ہے، اگر ان کا تدارُک اس طرح پر ہو جائے کہ:

(الف)　الفاظ متروکہ اور غیر مشہورہ کی جگہ الفاظِ مستعملہ اور مشہورہ بدل دیے جائیں۔

(ب)　اور اِبہام کے موقع پر کوئی مختصر لفظ بڑھا کر۔

(ج)　یا اَلفاظ میں کوئی تصرف مناسب کر کر واضح کر دیا جائے۔

تو بـإذنِ اللّٰـه (اللہ کے حکم سے) اس صدقۂ جاریہ کی بقا کی صورت نکل سکتی ہے اور ہم بھی محرومی کی مضرت (نقصان) اور ناشکری کی نحوست سے بچ سکتے ہیں۔

علمائے کرام ہر زمانے میں حسبِ حاجت اپنی ہمت اور توجہ سے ''تراجمِ مستقِلّہ'' اہلِ اسلام کی ہدایت اور نفع رسانی کے لیے مہیا فرماتے رہتے ہیں۔ ہم اگر یہ نہ کر سکیں تو آؤ ایک افضل اور مقبول و مفید ترجمے کی برائے نام خدمت کر کے اُن حضرات سے کچھ مناسبت و مشابہت کی برکت وعزت ہی حاصل کر لیں اور شاید اس حیلے سے خدامِ کلامِ الٰہی کی فہرست کے کسی گوشے پر جگہ مل جائے۔ بہ قول شخصے ؎

بوسم　من　بے　برگ　و　نوا　برگِ　حنا　را
تا　بوسہ　بہ　پیغام　دہم　آں　کف　پا　را [21]

(میں　بے　سر　و　سامان　نے　مہندی　کے　پتے　کا　بوسہ　لیا
تاکہ　یہ　بوسہ　اُس　کے　ہاتھوں　اور　پاؤں　کو　میرا　پیغام　دے　دے)

(مخلصین اور مکرّمین نے بھی اس سے اتفاق کیا)

اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جب اپنے مخلصین اور مکرمین کے رُو بہ رُو پیش کیا تو اُن حضرات نے بھی احقر کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا اور بالآخر یہی قرار پایا کہ بے شک مستقل ترجمے سے زیادہ مفید اور کارآمد یہی امر ہے کہ ترجمۂ موصوفہ (موضحِ قرآن) کی خدمت گزاری میں سعی کی جائے۔ خدا کرے کہ یہ سعی ٹھکانے لگ جائے اور ہر دو خلجان مذکورہ بالا سے ترجمۂ موصوف صاف ہو کر اپنی فصاحت وسلاست سے دور نہ جا پڑے۔

اللّٰهمّ ألهِمني رُشدي، و أعِذني من شرّ نفسي.
(اے اللہ! میری ہدایت کا مجھے الہام فرما اور مجھے اپنے نفس کے شرّ سے بچا)

(ترجمۂ قرآن حکیم کا آغاز)

ان مراحل کے طے کرنے کے بعد یہ عاجز وضعیف ترجمۂ موصوفہ (زیرِ بیان ترجمہ) کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھ کر بہ نامِ خدا مستعد ہو گیا اور کام شروع کر دیا۔ گویا اپنی تہی دستی اور بے مائیگی کی وجہ سے ایک گراں بہا دوشالہ (بڑی مہنگی شال) میں

بوسیدہ کمبل سے رَفو کرنے کا ارادہ کردیا۔ خداوند — **ستّارُ العُیوب** — کی پردہ پوشی سے اگر ہمارے ناچیز کلمات مصری کے دھاگوں اور غلے کے سنگ ریزوں اور تنکوں کی طرح کسی حساب میں آجائیں تو کون مانع ہے۔

و هو المَلِک البرّ الرّؤف الرّحیم (اور وہ بادشاہ محسن، شفقت والا، نہایت رحم والا ہے) ؎

شنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم [22]
(مَیں نے سنا ہے کہ امید و خوف کے دن (روزِ قیامت) میں
بُروں کو نیکوں کے سبب سے اللہ کریم بخش دے گا)

وگرنہ ہم کیا ہیں، جو کوئی کام ہم سے ہوگا۔

(ایک تہائی ترجمے کے بعد آنے والے مشکل حالات)

جب ایک ثلث قرآن (تہائی قرآن) کے ترجمے کی خدمت اور درستی سے فارغ ہوگئے تو ایسا طویل و بعید حرج (سفرِ حرمین شریفین اور مالٹا کی قیدکا) پیش آیا کہ ترجمہ موصوفہ کی تکمیل کا خیال فراموش شدہ خواب سے زیادہ باوقعت نہ تھا، مگر **باِذن اللّٰہ** (اللہ کے حکم سے) وہی حرج قیاس اور توقع کے خلاف سرمایۂ اطمینان بن گیا اور ارشاد:

عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّـكُمْ [23]
(شاید کہ تم کو بُری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں)

کی صداقت اور دعائے (حضرت یوسف علیہ السلام):

رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَىَّ [24] (اے ربّ! مجھ کو قید پسند ہے اُس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں)

کی اِجابت (قبولیت) گویا آنکھوں سے دیکھ لی۔ [25]

اور گو سامان ناکافی تھا، مگر اس پر بھی خدمت مذکور عرصۂ قلیل میں ۱۳۳۶ھ (1918ء) کے اندر ایسے اطمینان سے پوری ہوگئی کہ جو اطمینان سامان کی حالت میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ ؎

در خواب ندیدہ بود میلے
آسودگیٔ کہ در لحد دید [26]
(اے میلے! (شاعر مرزا قلی) خواب میں بھی وہ آرام نہیں دیکھا
وہ آرام کہ جو قبر میں دیکھا)

(جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا:)

اِنَّ رَبِّىۡ لَطِيۡفٌ لِّمَا يَشَآءُ [27] (میرا ربّ تدبیر سے کرتا ہے، جو چاہتا ہے۔) **و الحمد للّٰہ**.

(احبابِ مکرّمین کی خدمت میں پہنچ کر یہ ترجمہ پیش کریں گے)

اب حق تعالیٰ شانہٗ کو منظور ہے تو کسی وقت — جس کے علم سے ہم قاصر ہیں — احباب و مکرمین کی خدمت میں پہنچ کر اپنی

کوشش کو پیش کردیں گے۔[28] اگر ہماری یہ پیوندکاری کسی درجے میں مناسب اور مفید سمجھی گئی تو بإذن اللّٰہ تعالیٰ شائع بھی ہوجائے گا، ورنہ مجبوراً جہاں ہے، وہیں رہے گا۔ ؎

گو نالہ نارسا ہو ، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی ، جو مجھ سے ہوسکا[29]

(ترجمے سے متعلق دو مختصر اور مفید باتیں)

اس کے بعد ضروری ہے کہ:

(1) حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل ترجمے کی نسبت (2) اور اپنی ناچیز ترمیم کے متعلق

چند مختصر مفید باتیں عرض کردی جائیں، جن سے بالا جمال دونوں کی حالت اور کیفیت بھی معلوم ہوجائے۔ اور بعض شبہات، جن کے پیش آنے کا کھٹکا ہوتا ہے، وہ بھی رفع ہوجائیں۔

(1۔ ترجمہ ''موضحِ قرآن'' کے بنیادی اساسی اصول، اُمور اور فوائد کی اہمیت)

سو دیکھ لیجیے کہ حضرت ممدوح (شاہ عبدالقادر دہلویؒ) نے اپنے ترجمے کی بابت اتنا مضمون تو خود تحریر فرمادیا کہ:

''ہندی اور عربی کا محاورہ (آپس میں) موافق نہیں، اس لیے اگر قرآن شریف کی ترتیب کے ہر ہر لفظ کا جدا جدا ترجمہ کیا جاوے تو ہندیوں (اُردو بولنے والوں) کی سمجھ میں آنا دشوار ہو۔ سو اس وجہ سے ہم نے مجموعۂ آیت کی پابندی کی ہے۔ ہر ہر لفظ کی پابندی نہیں کی، یعنی ہندی محاورہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے، تحت لِفظی نہیں کیا۔''

یہ حضرت ممدوح کے ارشاد کا خلاصہ ہے[30]، مگر اس میں اجمال بہت ہے۔ کیوں کہ اس ارشاد سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ حضرت ممدوح ہر ہر لفظ کی پابندی نہ کریں گے، البتہ مجموعۂ آیت کی پابندی کرنی ضرور ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ:

(الف) ہر ہر لفظ کی عدمِ پابندی (پابندی نہ کرنے) کی کیا حد ہے؟

(ب) اور تقدیم و تاخیر —یعنی خلافِ ترتیب— کو کس حد تک جائز رکھا ہے:

(i) صرف بہ قدرِ ضرورت الفاظ کو کچھ آگے پیچھے کرلیا ہے۔

(ii) یا مجموعہ آیت کے احاطے میں محدود رہ کر پھر کسی تقدیم و تاخیر کی پرواہ نہیں کی۔

(iii) تھوڑی ہو یا بہت، ضروری ہو یا غیر ضروری، ایک تغیر ہو یا متعدد۔

علاوہ ازیں حضرت ممدوحؒ نے اس امر کو اجمالاً اور اشارتاً بھی نہیں بتلایا کہ ہم نے اپنے ترجمے میں:

(1) کس کس امر کی رعایت رکھی ہے۔

(2) اور کن کن فوائد کا لحاظ اور التزام کیا ہے۔

(ا۔ موضحِ قرآن میں کن کن اُمور کی رعایت رکھی گئی ہے)

سو احقر ان دونوں باتوں کو مفید سمجھتا ہے۔ اُن کی نسبت کچھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، مگر احتیاطاً:

(1) اوّل (پہلے) یہ عرض کیے دیتا ہے کہ ان ہر دو امر (عدمِ پابندی کی حد اور تقدیم و تاخیر کی نوعیت) کے متعلق جو کچھ عرض کیا جاوے گا، وہ ''موضح قرآن'' ہی سے مستنبط (اخذ کیا ہوا) ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس ذریعۂ علم اَور کیا ہے۔

اس کی مثال بعینہٖ ایسے سمجھئے جیسا علمائے کرام نے خاتم المحدّثین حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی خود (اپنی) کتاب صحیح بخاری سے استنباط فرما کر اُن کے اصول و قواعد، شروط و قیود اور اغراض و مقاصد کو بیان کر دیا ہے۔

البتہ صرف اتنی بات ضروری ہے کہ ہم جس امر کو حضرت ممدوح کی طرف منسوب کریں، اُس کا ماخذ ''موضح قرآن'' میں دکھلا دیں۔ اس کے بعد نہ کسی قسم کے خلجان کا موقع، نہ کسی شبہ کی گنجائش۔

(2) بہت سے بہت ممکن ہے تو یہ ہے کہ ہم اپنے فہم کے موافق حضرت ممدوح کے کسی خفیف اشارے سے جو بات سمجھیں، کسی کی رائے میں وہ ہمارا وہم سمجھا جائے۔ سو:

(الف) اوّل تو یہ امر نہ ہم سے مستبعد (بعید ہے)، نہ ہم کو اس سے انکار (ہے)، بلکہ بہ شرطِ اطلاع و انصاف — ان شاء اللہ — مشکوری کے ساتھ تسلیم کرنے کو حاضر ہیں۔

(ب) دوسرے چوں کہ 'وہم' انسان کے اوصافِ لازمہ (لازمی صفات) میں سے ہے۔ اِدھر بہ وجہ اختلافِ فہم و ذوق اشاراتِ لطیفہ (لطیف اشاروں) کے سمجھنے میں طبائع (طبیعتوں) میں اختلاف ہے۔ نیز بہ وجہ غلبۂ 'وہم' امرِ موہوم (وہم پر مبنی کام) کسی کو محقَّق (حقیقت) نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی کو امرِ محقَّق (حقیقی بات) بہ وجہ قلتِ تدبر (غور و فکر کی کمی سے) موہوم (وہمی کام) معلوم ہوتا ہے۔ اِن وجوہ سے اس کھٹکے سے کسی کو بھی بالکل مطمئن ہونا ٹھیک نہیں۔ و **الانصاف خير من الاعتساف** (تنگ نظری کے بجائے انصاف سے کام لینا زیادہ بہتر ہے)۔

(1۔ موضحِ قرآن میں ترتیبِ قرآنی کا ہر موقع پر لحاظ)

اس کے بعد امرِ اوّل کی نسبت تو یہ عرض ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو باوجود پابندئ محاورات ترتیبِ قرآنی کا ہر موقع پر لحاظ رہتا ہے اور اُس کی رعایت میں ہرگز تساہل نہیں فرماتے۔ یہ نہیں کہ محاورات کے التزام کی وجہ سے ترتیبِ قرآنی کے اہتمام میں کوتاہی ہو جائے۔ کیوں کہ:

(1) اوّل تو ترجمے کی اصل یہی ہے کہ حتیٰ الامکان مطابق اصل ہو۔

(2) دوسرے حضرت ممدوح و مرحوم کا ارشاد جو ابھی گزرا، اُس سے بھی مترشح ہے کہ اصل اور ترجمے میں موافقت ہونی چاہیے، ورنہ عذر فرمانے کی حاجت کیا تھی۔

ان دونوں وجہوں کے بعد اس امر کی کھلی اور قوی دلیل خود ''موضحِ قرآن'' سامنے ہے۔ اس کے مطالعے سے صاف نظر آتا ہے کہ حضرت ممدوحؒ نے ترتیبِ قرآنی کی کس درجے رعایت ہر جگہ ملحوظ رکھی ہے۔ اور اس میں کتنے تغیر (اور تبدیلی) کو اور کس ضرورت سے رَوا رکھا ہے۔ سو ترجمۂ موصوف کے مطالعے سے بالبداہت (ظاہری طور پر) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ممدوح ترتیبِ قرآنی کے محفوظ رکھنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہیں فرماتے۔ صرف اس ضرورت سے — کہ بہ وجہ ضرورتِ مذکورہ بالا ترجمہ با محاورہ کا التزام فرمایا ہے — تقدیم تاخیر کرنی ضروری ہے، مگر جیسا کہ ''آٹے میں نمک'' اور ''اُڑد پر سفیدی'' اور وہ بھی بہ قدرِ حاجت۔

یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اوّل اور اوّل آیت کا آخر ہوجائے۔ فصل بعید (بہت زیادہ آگے پیچھے کرنے) سے بہت احتیاط رکھتے ہیں، إلّا ماشاء اللّٰہ کسی خاص ضرورت سے دو تین کلموں کا فصل (فاصلہ) ہوجائے اور وہ بھی شاذ و نادر۔

(2۔ ''موضحِ قرآن'' میں محاورات کے استعمال سے متعلق اُمور)

یہ مختصر بات بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت ممدوحؒ کو چوں کہ محاورات کا بتلانا ہرگز مقصود نہیں، بلکہ محاورات کے ذریعے سے معنی اور مطلبِ قرآن کا بہ سہولت عوام کو سمجھانا مقصود ہے، اس لیے ''موضح'' میں محاورات برابر ہر جگہ معنیٔ قرآن کے تابع نظر آتے ہیں اور مقدارِ حاجت (ضرورت) سے زائد بہ تکلُّف (زبردستی) محاورات کو ٹھونسنا ''موضح'' میں کہیں نہ ملے گا۔

اور جن (مترجموں) کا مبلغِ پرواز اور مایۂ ناز یہی ہے، اُن صاحبوں نے جا بے جا الفاظِ محاورات کو ٹھونس ٹھونس کر بعض مواقع میں تو بہ جائے سہولت کے اُلٹا اشکال بڑھا دیا ہے اور بعض مواقع میں یہ غضب کیا ہے کہ معنی اصلی اور واقعی ہی بالکل بدل کر کچھ کے کچھ ہوگئے اور محاورے کے شوق میں اس قباحت و شناعت (برائی) کی اُن کو کچھ پرواہ نہ ہوئی، یا یوں کہو تمیز نہیں ہوئی۔ **فالحذر الحذر** (اس سے بچو اور پھر بچو)۔ (31)

(3۔ ''موضحِ قرآن'' میں بلاوجہ ترتیبِ الفاظِ قرآنی کی مخالفت نہیں)

بالجملہ بلاوجہِ وجیہ (کسی ضروری وَجہ کے بغیر) مخالفت ترتیب (الفاظِ قرآنی) سے احتراز فرماتے ہیں اور قدرِ حاجت سے زائد کو رَوا (جائز) نہیں رکھتے:

(الف: مضاف، مضاف الیہ کے ترجمے میں شاہ صاحبؒ کا اُسلوب)

مثلاً زبانِ عرب میں ''مضاف'' کو مقدم (پہلے) ذکر کرتے ہیں اور محاورۂ اُردو میں ''مضاف الیہ'' کو پہلے لاتے ہیں۔ وہ (عرب لوگ) ''غـــلامُ زیـــدٍ'' کہتے ہیں تو یہ (اُردو بولنے والے) ''زید کا غلام'' بولتے ہیں۔ سو ترتیب تو بدل گئی، مگر اوّل تو محاورے کی مجبوری، دوسرے تغیر نہایت قلیل، جس سے (دونوں کلموں میں) اتصال زائل نہیں ہوا اور دونوں کلموں میں فاصلہ کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے حاجت کے وقت یہ خفیف اختلاف قابلِ لحاظ نہ ہوگا۔

اس کی مثالیں ترجمۂ موصوف میں جگہ جگہ ملیں گی اور تحت لفظی ترجمہ میں چوں کہ یہ مجبوری نہیں، اس لیے یہ تغیر ترجمہ لفظی میں نظر نہ آئے گا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلافات جتنے بھی ہوں، ترجمہ بامحاورہ میں جائز، بلکہ ضروری سمجھے جائیں گے۔ حتیٰ کہ اگر بامحاورہ ترجمہ میں یہ اختلاف نہ ہوں تو وہ ترجمہ بامحاورہ نہ سمجھا جائے گا اور بامحاورہ ترجمے میں اس قسم کے جتنے کثرت سے اختلافات ہوں گے، اسی قدر اس کے بامحاورہ ہونے کی تصدیق اور اُس کی خوبی سمجھی جائے گی۔

مگر حضرت ممدوح اس پر بھی ''مضاف الیہ'' کو ہر جگہ مقدم نہیں لاتے، بلکہ جہاں گنجائش مل جاتی ہے، وہاں بہ وجہ عدمِ ضرورت اس قلیل تغیر کو بھی ترک فرما کر ترتیبِ قرآنی ہی کو قائم رکھتے ہیں۔

مثلاً ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (سب تعریف اللہ کو ہے، جو صاحب سارے جہاں کا) میں چوں کہ ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (میں ربّ) مضاف اور (العالَمین) مضاف الیہ (اللہ تعالیٰ کی) صفت واقع ہیں تو اس کے ترجمے میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ

(صاحب سارے جہاں کا) ترتیبِ قرآنی کے مطابق بھی رہے اور محاورے کے خلاف بھی نہ ہو اور ایسے نظائر بہ کثرت ملیں گے۔

خلاصہ یہ کہ پابندیٔ محاورہ تو ضروری ہے اور اس ضرورت سے جو خلافِ ترتیب (الفاظِ قرآنی) کرنا پڑے، وہ مستثنیٰ اور مستحسن اور ضروری ہے۔ باقی اس ضرورت کے علاوہ (شاہ صاحبؒ) خلافِ ترتیب (قرآنی) کو ہرگز اختیار نہیں فرماتے، بلکہ ترجمہ تحتِ لفظی (کی) موافقتِ ترتیب کو لازم و واجب سمجھتے ہیں۔

(ب: فعل اور اُس کے متعلقات کے ترجمے میں ترتیبِ قرآنی کا لحاظ)

یہی حال فعل اور مفعول اور دیگر متعلقاتِ فعل اور صفت، موصوف، حال، تمیز وغیرہ کا (ہے) کہ اکثر مواقع میں ترتیبِ قرآنی کی متابعت فرماتے ہیں اور بعض مقامات میں بہ وجہ رعایت محاورہ و سہولت' اسی تغیرِ خفیف — مذکورہ بالا — سے کام لیتے ہیں۔

(ج: حروفِ ربط کے حوالے سے ترجمے کا انداز و اُسلوب)

اَور لیجیے حروفِ ربط، جن کو ''حروفِ جر'' کہتے ہیں، جگہ جگہ بہ کثرت مستعمل ہیں، جیسے لام، بَاء، کَاف، عَلٰی، إلٰی، مِنْ، عَنْ، فِیْ وغیرہ۔ اور کلامِ عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں، لیکن ہماری زبان (اُردو) میں عموماً مؤخر بولے جاتے ہیں، مگر قلیل و نادر۔

سو اِن حروف میں بعض حروف تو ایسے ہیں کہ اُن کا ہماری زبان میں مؤخر ہونا ایسا ضروری ہے کہ مقدم لانے کی کوئی صورت ہی نہیں، جیسے مِنْ اور عَنْ۔ کلامِ اُردو میں ممکن نہیں کہ مِنْ اور عَنْ کا ترجمہ اُن کے معمول سے مقدم ہو سکے اور ترتیبِ قرآنی کی موافقت کر سکیں۔ اسی وجہ سے ترجمہ تحتِ لفظی میں بھی یہ تغیر اور اختلاف بہ مجبوری قبول کرنا پڑتا ہے۔

باقی اکثر حروفِ (جارہ) ایسے ہیں کہ اُن کو ہماری زبان میں مقدم کرنا گو جائز ہے، مگر محاورے کے خلاف ہے، جیسے إلٰی، عَلٰی، فِیْ وغیرہ۔ سو اُن کو ترجمہ تحتِ لفظی میں تو نظمِ قرآنی کے موافق مقدم لائیں گے، لیکن بامحاورہ ترجمے میں اُن کو بھی مثلِ قسمِ سابق مؤخر لانا پڑے گا۔ مگر اس برائے نام اختلاف کو بھی بامحاورہ ترجمے میں ایسا ہی مقبول سمجھنا چاہیے، جیسا اختلافِ سابق ہر ایک اُردو ترجمے میں مقبول تھا۔ کیوں کہ یہ حروف:

(1) اوّل: فی نفسہٖ (اپنی ساخت کے اعتبار سے) غیر مستقل اور تابع محض ہیں۔ صرف اُن کا تقدُّم تأخُّر (آگے پیچھے ہونا) بھی کوئی مستقل اختلاف اور قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

(2) دوسرے: (حروف کے ترجمے میں آگے پیچھے ہونا) بے وجہ نہیں، بلکہ بہ وجہ ضرورتِ مسلمہ اختیار کرنا پڑا ہے، حتیٰ کہ محاورہ اُردو میں اس کی مخالفت کی گنجائش ہی نہیں۔

(3) تیسرے: اتنا لطیف و خفیف اختلاف ہے کہ جس سے اتصال میں فرق نہیں آیا۔

اور ان سب امور کے بعد پھر وہی بات ہے، جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یعنی جہاں کچھ گنجائش ہوتی ہے، وہاں (شاہ صاحبؒ) اس خفیف تغیر (معمولی تبدیلی) کو بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ ترتیبِ قرآنی کی رعایت فرماتے ہیں اور ایسا ترجمہ اختیار کرتے ہیں جو ترتیبِ قرآنی اور محاورہ دونوں کے موافق ہو۔

اس کی مثالیں حروفِ (جارہ) مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں۔

مثلاً ''إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ'' کا ترجمہ ''مگر انھیں پر جن کے دل پگھلے ہیں'' فرمایا ہے، جس میں لفظ ''علیٰ'' کا ترجمہ ''خاشعین'' کے ترجمے سے مقدم (پہلے) ہے اور محاورے کے بھی مطابق ہے۔

(4۔ ''موضحِ قرآن'' میں جگہ جگہ تغیرات کی حقیقت)

بالجملہ! ''موضحِ قرآن'' میں جو جگہ جگہ وہ تغیرات نظر آتے ہیں، جو ترجمہ تحتِ لفظی میں نہیں پائے جاتے، اُن کی وجہ سے بہ شرطِ فہم و انصاف:

(الف) نہ موضح قرآن میں کسی خدشے اور شبہے کی گنجائش ہے۔ [32]

(ب) اور نہ ان کو حجت (دلیل) بنا کر ترجمہ با محاورہ میں تقدیم و تاخیر کا دروازہ کھول دینا مناسب ہے۔ [33]

جگہ جگہ تغیر و اختلاف کا نظر آنا اہلِ فہم کے نزدیک ہرگز قابل لحاظ نہیں۔ قابلِ لحاظ ہے تو یہ ہے کہ حضرت ممدوح جو تغیر کرتے ہیں، وہ نہایت بجا تُلا عند الحاجت اور بہ قدرِ ضرورت، جس کی وجہ سے ترجمہ موضح قرآن جیسے التزام اور خوبی محاورات میں بےنظیر ہے، ویسا ہی باجود پابندیٔ محاورات' علتِ تغیر (تبدیلی کا سبب) اور خفتِ تبدل (معمولی تبدیلی) میں بے عدیل (بےنظیر) ہے۔ سو اب ہم کو یہ دیکھنا نہ چاہیے کہ حضرت ممدوح نے کتنے مواقع میں تغیر کیا، بلکہ اہلِ فہم کے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تغیر کیوں کیا اور کتنا تغیر کیا۔

البتہ ان معمولی مذکورہ بالا اختلاف کے سوا بھی بعض بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں محاورۂ اُردو کے ساتھ ترتیبِ قرآنی کو قائم رکھنا دشوار ہے، یا ترتیب کی رعایت سے معنی میں اِغلاق (اُلجھاؤ) پیدا ہوتا ہے۔ سو حضرت ممدوح اُن مقامات میں بھی بہ نظرِ غائر (گہری نظر سے) ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ اور ترتیب دونوں کی رعایت ہو، یا فرق آئے تو خفیف (بہت ہلکا سا)۔ اور معنی بھی مُغلَق (پیچیدہ) نہ ہوں۔

ان کے علاوہ بہت سے تصرفاتِ خفیفہ (معمولی تبدیلیاں) اَور (مزید) بھی کر جاتے ہیں۔

مثلاً بہ ضرورتِ ایضاح (وضاحت کے لیے):

(الف) کہیں مختصر لفظ ترجمے میں بڑھا دیا۔

(ب) یا کہیں مرجعِ ضمیر کو ظاہر کر دیا۔

(ج) کہیں لفظ مقدر کی تصریح فرما دی۔

علیٰ ھٰذا (اسی طرح) کبھی ترجمے میں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) بعض جگہ ''إنّ'' کا ترجمہ نہیں کرتے۔

(ب) ''یا أبت'' کا ترجمہ ''اے باپ'' فرماتے ہیں، ''اے میرے باپ'' نہیں فرماتے۔

(ج) ایسے ہی ''یا بُنیّ'' کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ صرف ''اے بیٹے'' فرمایا ہے۔

(د) ''یا ربِّ'' کا ترجمہ متعدد مواقع میں ''اے ربّ'' ذکر کیا ہے۔

(ہ) کبھی ضمیر کا ترجمہ چھوڑ جاتے ہیں۔

(و) کبھی صیغۂ مبالغہ کے ترجمے میں مبالغے کو ذکر نہیں فرماتے وغیرہ وغیرہ۔

سو اِس قسم کے خفیف تصرفات میں کوئی حرج نہیں۔ ان میں کے اکثر تصرفات تراجمِ لفظیہ تلک میں موجود ہیں۔

(۲۔ ''موضحِ قرآن'' میں ترجمے کے کن فوائد کا لحاظ اور التزام کیا گیا ہے؟)

اب باقی رہا امرِ ثانی، یعنی حضرت ممدوح نے ترجمے میں کس کس امر کا خیال رکھا ہے؟ سو ترجمۂ موصوف کے مطالعے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ عامۃً (عام طور پر) ترجمے میں چند اُمور کا التزام و لحاظ بہت ہے:

(الف) اختصار، وسہولت، و وضاحت۔

(ب) اور الفاظِ قرآنی کی لفظی و معنوی مطابقت۔

(ج) اور معنی مرادی یعنی غرض و مقصودِ کلام کی رعایت۔ جس کی وجہ سے مدعا کلامِ الٰہی کے سمجھنے میں اعانت ملتی ہے۔

ان امور کے علاوہ ترجمے میں:

(الف) کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں، جس سے کسی اجمال وابہام کا کھولنا مقصود ہوتا ہے۔

(ج) کبھی کسی اِشکال وشبہ سے بچنے کی غرض سے کوئی لفظ اختیار فرماتے ہیں۔

(د) بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ اَور۔ جس کی وجہ سے مطلب میں سہولت ہو جاتی ہے۔

(ہ) کبھی کوئی فائدہ جدید ترجمے سے زائد بتلا جاتے ہیں۔

(و) بہ غرضِ سہولت و وضاحت کبھی مضمونِ ایجابی (مثبت) کو عنوانِ سلبی (منفی) میں ادا فرماتے ہیں۔

(ز) بہت سے مقامات میں نفی و اِثبات کا جدا جدا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے، اس کو مختصر سلیس الفاظ میں محاورے کے موافق ادا فرما دیتے ہیں۔

(ح) حال وتمیز، بدل وغیرہ، حتیٰ کہ مفعولِ مطلق کے عنوان کی رعایت رکھتے ہیں اور محاورے کے موافق۔

الغرض! الفاظ و معانی دونوں کے متعلق ہر طرح سے غور اور اہتمام سے کام لیا ہے اور مقاصد کی تسہیل میں سعی اور احتیاط میں کوتاہی نہیں کی۔ اہلِ فہم کو بہ شرطِ توجہ ہمارے معروضات کی صداقت ہر جگہ ان شاء اللہ ملے گی۔ اس سے زیادہ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔

باقی ہمیں ہرگز ہرگز شبہ نہیں کہ حضرات علمائے متدیّنین میں جس نے اس (ترجمۂ قرآن کی) مبارک خدمت کو انجام دیا ہے، اُس نے اپنے فہم و مذاق کے موافق اس قسم کے فوائد کا پورا اہتمام کیا ہے اور ہر طرح کی خوبی اور احتیاط میں غور فرما کر اس امرِ مہتمّ بالشان کو انجام دیا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ فضائل و کمالاتِ خدا کے علاوہ حضرت ممدوح نے جس غور و اہتمام سے اس خدمت کو انجام دیا ہے، وہ بے نظیر ہے۔ ہر موقع پر چھوٹے بڑے لفظی، معنوی اُمور کا اتنا خیال رکھتے ہیں اور اُن اُمور کی اس قدر رعایت فرماتے ہیں کہ اکثر مقامات میں بے ارادہ کسی کا قول یاد آجاتا ہے ؎

زِ فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جا است [34]

(ایک قدم سے دوسرے قدم کے فرق تک جہاں کہیں بھی میں دیکھتا ہوں، ایسا کرشمہ
نظر آتا ہے جو دل کے دامن کو اُس جگہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے کہ یہی تو اصل جگہ ہے)

اس لیے کَمّاً و کَیفاً (مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے) اس قسم کے چھوٹے بڑے فائدے ''موضحِ قرآن'' میں زیادہ نظر آتے ہیں اور بلا مبالغہ ''سہلِ ممتنع'' کہنے کو دل چاہتا ہے۔

(''موضحِ قرآن'' الہامی ترجمۂ قرآن)

اسی کے ساتھ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ حضرت ممدوح کے اس علمی و عملی کمالات پر اُن کی تالیفات بجز ''موضحِ قرآن'' ہم کو نظر نہیں آتیں تو یہی دل میں آتا ہے کہ کسی قوی محرک نے حضرت ممدوح کو اس خدمت پر متوجہ کیا ہے۔ اور حضرت (شاہ عبدالقادر دہلوی) رحمۃ اللہ علیہ نے اس خدمت کو اپنی آوُرد (زبردستی کے خیالات) کے زور اور معمولی توجہ سے انجام نہیں دیا، بلکہ جو کچھ کیا ہے، وہ آمد (من جانب اللہ پیدا ہونے والے خیالات) کے جوش اور قلبی شوق سے کیا ہے۔ چناں چہ احقر نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس خدمت سے فارغ ہوگئے تو کسی کا شعر کچھ تصرف فرما کر اس طرح پڑھتے تھے ؎

روزِ قیامت ہر کسے کہ باخویش دارد نامہ
مَن نیز حاضر مے شَوَم ''تفسیرِ قرآں'' در بغل [35]
(جب قیامت کے دن ہر کوئی اپنا نامۂ اعمال لے کر آئے گا
میں بھی اپنی بغل میں تفسیرِ قرآن لے کر حاضر ہوں گا)

(''موضحِ قرآن'' کے تفسیری فوائد کی اہمیت)

اَور (مزید یہ کہ) مناسبات اور متعلقات' ترجمہ ہی میں منحصر نہیں، بلکہ:

(الف) بعض مقامات میں حضرات مفسرین اور شُرّاحِ حدیث کے مبسوط اِرشادات کا خلاصہ' ایک دو لفظ میں بہ سہولت بتلا جاتے ہیں۔ بعض مواقع میں حضرت ممدوح کا ایک دو کلمہ، (مفسرین کے) مبسوط ارشادات سے أحقّ بالقبول (قبولیت کا زیادہ حق دار) ہوتا ہے۔

(ب) دفعِ اِلتباس (اُلجھاؤ کو دور کرنے) اور رفعِ اِشکال (کسی سوال کا جواب دینے) کا بہت خیال رکھتے ہیں اور باوجود اِن اُمور کے ترجمہ اپنے محدود اِحاطے سے ایک قدم آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ [36]

الحاصل! تراجمِ معتبرہ (معتبر ترجموں) میں غور کرنے سے (ترجمہ نگاروں کے بارے میں):

(۱) اِکرام: فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَيۡمٰنَ‌ ۚ وَكُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّعِلۡمًا [37] (پس ہم نے سلیمان علیہ السلام کو اُس کا فہم دیا اور ہر ایک نبی کو علم اور حکم عطا کیا)۔

(۲) اور اِنعام: اَلَنَّا لَهُ الۡحَدِيۡدَ [38] (حضرت داوٗد علیہ السلام کے لیے ہم نے لوہے کو گرم کر دیا)۔

کا نقشہ ضرور نظر آتا ہے۔ بارک اللّٰہ فی حسناتھم، و أفاض علینا من فُیُوضھم و برکاتھم (اللہ تعالیٰ اُن کی

نیکیوں میں برکت عطا فرمائے اور ہم پر اُن کے فیوض و برکات کا فیضان فرمائے)۔

(''موضحِ قرآن'' کے فوائد کی چند مثالیں)

اس کے بعد بے شک اس امر کی ضرورت ہے کہ جیسے ہم نے یہ چند فوائد بلا دلیل عرض کر دیے ہیں، ایسے ہی کسی موقع سے چند مثالیں بھی عرض کر دی جائیں، تا کہ ہماری معروضات کے لیے موجبِ تصدیق ہو اور بہ طورِ نمونہ ترجمۂ موصوف کی کچھ حالت معلوم ہو کر ناظرین کے لیے باعثِ اطمینان ہو۔

سو شروع ہی سے لیجیے اور جو بات ہماری معروضات میں مجمل ہو، اُس کو موضح قرآن میں ملاحظہ فرما لی جائے۔

(مثال 1: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا ترجمہ)

دیکھیے! ''بِسۡمِ اللّٰہِ'' کا ترجمہ (''شروع اللہ کے نام سے'') محاورے کے مطابق کیا ہے، جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بہ قدر مناسب رعایت ملحوظ ہے۔ اس سے بہتر اور سلیس و حسین ترجمہ اُردو میں نظر نہیں آتا۔ اور ''رحمن'' (''جو بڑا مہربان'') اور ''رحیم'' (''نہایت رحم والا'') جو مبالغے کے صیغے ہیں، اُن کے مبالغے کو بھی ظاہر فرما دیا اور دونوں کے فرقِ مراتب کی طرف بھی اشارۂ لطیف کر دیا۔ تراجمِ سابقہ (گزشتہ ترجموں) میں بہ وجہِ عدمِ ضرورت مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔ اس کے بعد سورتِ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ اسی کے مطابق کیا۔

(مثال 2: یَوۡمِ الدِّیۡنِ کا ترجمہ)

''یَوۡمِ الدِّیۡنِ'' کا ترجمہ اکثر حضرات نے ''روزِ جزا'' یا ''دن جزا'' فرمایا ہے، مگر اوّل تو شاہ صاحبؒ نے فرما دیا ہے کہ میں نے عوام کی بول چال میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کی بول چال میں ''جزا'' کا لفظ شائع (مشہور) نہیں۔ دوسرے اہلِ لغت اور علمائے مفسرین نے دین کے معنی ''جزا'' اور ''حساب'' دونوں تحریر فرمائے ہیں۔ ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے ''جزا'' کے لفظ کو چھوڑ کر اس کے بدلے میں ''انصاف'' کا لفظ اختیار فرمایا کہ یہ لفظ عوام میں مشہور ہے اور اس ایک لفظ میں ''جزا'' اور ''حساب'' دونوں آ گئے۔

(مثال 3: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ کا ترجمہ)

''اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ'': ہدایت کا ذکر کلامِ الٰہی میں جگہ جگہ آتا ہے۔ سو حضرات مترجمین اس کے ترجمے میں اکثر تو لفظ ''ہدایت'' ہی فرما جاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لفظ فارسی، اُردو دونوں میں شائع ہے اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ فرماتے ہیں تو فارسی والے ''راہ نمائی'' سے اور اُردو والے ''رستہ دکھلانے'' سے ترجمہ کرتے ہیں، مگر حضرت ممدوح کی عادت ہے کہ:

(۱) اوّل تو عامۃً (عام طور پر) ترجمہ اپنی زبان میں فرماتے ہیں، إلّا ماشاء اللّٰہ۔

(۲) دوسرے چوں کہ ''ہدایت'' کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے:

(الف) ایک صرف ''رستہ دکھلانا'' (ب) دوسرے ''منزلِ مقصود تلک پہنچا دینا''

اوّل کو ''اِراءۃ'' (راستہ دکھانا)، دوسرے کو ''ایصال'' (مقصود تک پہنچانا) کہتے ہیں۔

www.rahimia.org

تو اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ ہر موقع پر اس کا بھی لحاظ رکھتے ہیں کہ ’’ہدایت‘‘ کے کون سے معنی مراد اور اس موقع کے مناسب ہیں اور اسی کے مناسب ’’ھدایت‘‘ کے ترجمے میں کوئی لفظ اختیار فرماتے ہیں۔ ہر جگہ اس کے ترجمے میں ’’راہ دکھانا‘‘ ہی نہیں فرماتے۔ سو اسی وجہ سے:

(الف) اَور (دوسرے) حضرات نے تو ’’اِهْدِنَا‘‘ کا ترجمہ ’’دکھا ہم کو‘‘ فرمایا اور حضرت ممدوح نے ’’چلا ہم کو‘‘ فرما کر ’’ایصال‘‘ کی طرف اشارہ کر دیا۔

(ب) اسی طرح ’’هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ‘‘ کے ترجمے میں اَور (دوسرے) حضرات نے تو ’’راہ دکھاتی ہے‘‘ یا ’’رہنما‘‘ فرمایا اور حضرت ممدوح نے ’’راہ بتاتی ہے‘‘ پسند کیا۔

چوں کہ ’’اِهْدِنَا‘‘ میں ’’ہدایت‘‘ حق تعالیٰ کا فعل ہے تو وہاں چلانے کا لفظ مناسب ہے۔ ’’هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ‘‘ میں ہدایت، قرآن کی صفت ہے۔ تو یہاں ’’بتانے‘‘ کا لفظ چسپاں ہے۔ ورنہ دونوں جگہ ’’ایصال‘‘ کی طرف اشارہ مقصود معلوم ہوتا ہے۔

فرحمه الله ما أدقّ نظرهٗ، و أرقّ الفاظُهٗ.

(اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت نازل فرمائے کہ اُن کی نظر کتنی گہری ہے اور اُن کے الفاظ کتنے نفیس ہیں۔)

(مثال 4: ’’متّقین‘‘ کا ترجمہ)

اس کے بعد ’’متّقین‘‘، میں حضرات مرحومین نے تقویٰ کا ترجمہ ’’پرہیزگاری‘‘ فرمایا ہے، جو شریعت میں مشہور اور ظاہر کے مطابق اور تفاسیرِ کثیرہ کے موافق ہے۔ پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ بیان فرمایا کہ ہدایت کے محتاج گمراہ ہیں، نہ متقی و پرہیزگار۔ اس لیے ’’هدى للضّالين‘‘، فرمانا مناسب تھا۔

سو بعض حضرات نے متقین کے معنی ’’صائرين إلىٰ التّقوىٰ‘‘ لے کر جواب دیا۔[39]

بعض نے دیگر جوابات سے شبہ مذکورہ کا قلع قمع کیا، مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر اس طرف گئی کہ ’’تقویٰ‘‘ کے اصطلاحی مشہور معنی چھوڑ کر اصلی اور لغوی معنی اختیار کیے اور ’’متقین‘‘ سے وہ لوگ مراد لیے، جن کے قلوب میں حق تعالیٰ کا خوف ہے۔ اس لیے ’’هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ‘‘ پر ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی ’’راہ دکھاتی ہے پرہیزگاروں کو‘‘ اس کو چھوڑ کر ’’راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو‘‘ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے شبہ مذکور کا موقع ہی نہ رہا، جو کسی جواب کی حاجت ہو۔

اور اگر ’’ھدایت‘‘ سے ’’ایصال‘‘ مراد لیویں جیسا کہ ترجمے میں حسبِ معروضاتِ سابقہ اُس کی طرف لطیف اشارہ مفہوم ہوتا ہے تو پھر تو شبہ کیا کسی وہمی کے توہّم کا بھی وہم نہیں ہوتا۔

(مثال 5: يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کا ترجمہ)

اس کے بعد ’’يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ‘‘ کا ترجمہ ’’ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے‘‘ یا ’’غیب پر‘‘ بالکل درست اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے اور لفظ ’’ایمان‘‘ اور ’’غیب‘‘ چوں کہ مشہور و معروف الفاظ ہیں، اس لیے دوسرے لفظوں سے اُن کے ترجمہ کرنے کی حاجت نہیں۔ لیکن:

(الف) ’’ایمان‘‘ کا لفظ عرفِ شریعت میں دو معنی میں شامل ہے:

(۱) ایک نفسِ تصدیق و یقین وتسلیمِ قلبی (دلی سپردگی) جو کہ امورِ دین اور احکامِ شریعت کے ساتھ متعلق ہو۔ جس کو ''حقیقتِ ایمانی'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور معنی لغوی کے بھی موافق ہے۔

(۲) دوسرے تصدیق قلبی اور اعمالِ ایمانی دونوں کا مجموعہ، جس کو ایمانِ کامل بھی کہتے ہیں۔

ادھر معروضاتِ سابقہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مترجم —**رحمہ اللہ** — کی عام عادت ہے کہ عوام کی بول چال میں ترجمہ کرتے ہیں اور جس لفظ کے معنی متعدد ہوتے ہیں، وہاں ترجمے میں ایسا لفظ لانا پسند فرماتے ہیں، جس سے وہ معنی معیّن ہو جائیں جو مطلوب اور مناسب مقام ہوں۔

(ب) اس کے بعد ''غیب'' کے معنی بے شک ظاہر ہیں، مگر اس کی تصریح نہیں کہ کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے۔ سو اِن باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجم ممدوح نے اُس صحیح اور مقبول ترجمے کے بدلے جس کو ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ ترجمہ اختیار کیا: ''یقین کرتے ہیں بِن دیکھے''۔ ترجمہ ہلکا سلیس عام فہم ہونے کے سوا ظاہر ہو گیا کہ یہاں ایمان کے اوّل معنی مراد ہیں، نہ ثانی۔

اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ''غیب'' کا یہ مطلب ہے کہ جو چیزیں اُن کی نظروں سے غائب ہیں، یعنی اُن پر اللہ اور رسول کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں جیسے بہشت، دوزخ، پُل صراط، وزنِ اعمال، عذابِ قبر، فرشتے، جنات، شیاطین وغیرہ وغیرہ۔

تنبیہ: (ایمان اور اسلام سے متعلق اہم بات)

''ایمان'' کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، اسم فاعل، امر، نہی، مختلف صیغوں کے ساتھ بہ کثرت موجود ہے۔ سو حضرات مترجمین تو عام طور پر اس کا ترجمہ لفظِ ''ایمان'' یا ''اسلام'' سے ذکر فرماتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں لفظ معروف اور مشہور ہیں، مگر حضرت ممدوح (شاہ عبدالقادر دہلویؒ) ''یقین''، ''ماننا''، ''اسلام''، ''ایمان''، جس لفظ کو کسی وجہِ ظاہری یا مخفی سے مناسبِ مقام دیکھتے ہیں، ہر جگہ اُس کی رعایت فرماتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کارآمد اور مفید (تفسیری اور تشریحی) باتیں ترجمے سے زائد بہ سہولت معلوم ہو جاتی ہیں۔

جیسا ابھی عرض کر چکا ہوں اور انہیں چھوٹے چھوٹے فَرقوں اور ہلکی ہلکی رعایتوں کی وجہ سے بڑے بڑے خلجان اور لمبی لمبی بحثیں بہ سہولت کبھی طے ہو جاتی ہیں اور تحقیقی بات معلوم ہو جاتی ہے:

مثلاً احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے کہ جب آیتِ کریمہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ [40]

(جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انھوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان، انھیں کے واسطے ہے دل جمعی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔)

نازل ہوئی تو صحابہ —**رضوان اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین**— پر نہایت شاق (بھاری) ہوئی اور اُن کو خلجانِ شدید (دلی اُلجھاؤ) پیدا ہوا۔ آخر آپؐ کی خدمت میں عرض کیا:

''**أیّنا لم یظلم نفسهٗ؟**'' یعنی: ''یا رسول اللہ! ہم میں ایسا کون ہے، جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو''۔

www.fahimia.org

یعنی اس سے کوئی گناہ نہ ہوا ہو؟ مطلب یہ کہ پھر اب تو ہم سب عذابِ الٰہی سے غیر مامون (غیر محفوظ) اور ہدایت سے محروم ہوگئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''لیس ذٰلک إنّما ھو الشّرک. ألم تسمعوا قول لُقمان لابنہٖ: '' یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ (41)''. (42)

یعنی آیت میں ظلم سے ''ظلمِ عظیم'' مراد ہے، جو شرک ہے۔ مطلق گناہ مراد نہیں۔ جو یہ خلجان پیش آوے تو اس ارشادِ (نبویؐ) سے وہ اشکال تو مرتفع (دور) ہوگیا، جو صحابہ کرامؓ کو موجبِ پریشانی ہوا تھا۔ اور آیت کا واقعی مطلب بالا جمال (اجمالی طور پر) سمجھ میں آ گیا، مگر یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ ارشاد فیض بنیاد کا ماخذ آیت میں کیا ہے؟ اور تقریر و تشریح جواب کی صورت کیا ہے؟ اس لیے اس میں حضرات علما کی تقریریں مختلف ہیں، جو اہلِ علم پر مخفی نہیں۔

ہر چند یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مباحث ترجمے کے احاطے سے بہت اوپر ہیں اور اُن کے لیے اَور (دوسرے) مواقع ہیں، مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی وسیع و دقیق نظر چوں کہ اُن کو بھی حتیٰ المقدور اور حسبِ گنجائش ترک کر دینا پسند نہیں کرتی تو سب طرف نظر ڈال کر آیتِ مذکورہ کا یہ ترجمہ فرمایا: ''جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر الخ''، جس سے معلوم ہوگیا کہ آیت میں ''ایمان'' سے ''حقیقتِ ایمانی'' یعنی: ''تصدیقِ قلبی'' مراد ہے۔ معنیٰ ثانی ''تصدیق مع الأعمال'' مراد نہیں، جو باعثِ خلجان ہو۔ سوا اہلِ علم و فہم کو تو اتنا ہی اشارہ سب کچھ ہے، مگر حضرت ممدوح نے ''ظلم'' کا ترجمہ لفظ ''تقصیر'' سے بیان فرما کر جس کی نظیر غالباً کسی اَور موقع پر نہ ملے گی، مطلب کو اَور بھی واضح کر دیا۔

اب اس میں غور کرنے سے بحمد اللہ دوسرا خلجان بھی صاف ہوگیا۔ دیکھئے دو لفظوں میں ایسی مُحقَّق (تحقیقی) بات فرما گئے کہ لمبی بحثوں کی حاجت نہ رہی۔ طُرفہ یہ کہ یہ تحقیق دو لفظی أحقّ بالقبول (قبولیت کی زیادہ حق دار) معلوم ہوتی ہے، جس سے:

(الف) حضرات صحابہؓ کے خلجان کا منشا (سبب بھی سمجھ آتا ہے)۔

(ب) اور ارشادِ نبوی — علیہ الصّلوٰۃ و السّلام — کا مأخذ بھی سمجھ میں آتا ہے۔

(ج) اور تقریرِ جواب میں جو بین العلماء خلاف (علما کے درمیان اختلاف) ہے، اُس کی کیفیت بھی سمجھ میں آتی ہے۔

(د) اور آیت کے ترجمے میں جو لفظ ''کچھ'' ظاہر فرمایا ہے، جو اَور (دوسرے) تراجم میں نظر نہیں آتا، وہ صاف بتلا رہا ہے کہ حضرت ممدوح کو اقوالِ علما پیشِ نظر ہیں اور اُس میں جو بات راجح ہے، اُس کو بتلانا چاہتے ہیں۔

تمثیلات کے ذیل میں چوں کہ استطراداً (بر سبیلِ تذکرہ) یہ ذکر آ گیا، اس لیے بسط (تفصیل) کا موقع نہیں۔ البتہ اپنے موقع پر بسط (تفصیل بیان کرنا) نامناسب نہ ہوگا۔

(مثال 6: مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ کا ترجمہ)

اس کے بعد ''مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ'' کے ترجمے (''اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں'') میں ''مِن'' تبعیضیہ کا ترجمہ لفظ ''کچھ'' سے ظاہر فرما کر ''ممانعتِ اِسراف'' (حد سے زیادہ خرچ کرنے کی ممانعت) کی طرف اشارہ بتلا گئے، جس سے اکثر تراجم خالی ہیں، جیسا کہ کتبِ تفسیر میں مصرّح (وضاحت کے ساتھ) موجود ہے۔

(مثال 7: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا ترجمہ)

''يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ'' کے ترجمے میں فرماتے ہیں: ''دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے'' جو سریع الفہم (جلدی سمجھ آنے والے) محاورے کے موافق ترجمہ ہے۔ اور ظاہری اور مشہور ترجمے میں جو خدشہ ہوسکتا ہے اور حضرات مفسرین کو اُس کے جواب کی ضرورت پڑتی ہے، اُس سے بھی بچاؤ ہوگیا، جیسا کہ تفاسیر میں موجود ہے۔

(مثال 8: عَذَابٌ اَلِيْمٌ کا ترجمہ)

''عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' کا ترجمہ ''دُکھ کی مار'' فرما کر بتلا گئے کہ ''فعیلٌ'' (الیم) بمعنی مفعولٌ (مؤلَم) ہے، جو شائع اور رائج استعمال ہے اور محاورہ اُردو بھی اُس کے مطابق ہے۔

(مثال 9: بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ کا ترجمہ)

''بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ'' میں ''يَكْذِبُوْنَ'' کا ترجمہ ''جھوٹ کہتے تھے'' فرمایا۔ ''جھوٹ بولتے تھے'' نہیں فرمایا، جو ظاہر اور محاورے کے موافق زیادہ نظر آتا ہے۔ سو اس کی وجہ — ان شاء اللہ — یہی ہے کہ:

(الف) جب کسی شخص کا علی العموم (عام طور پر) کاذب (جھوٹا) ہونا اور اُس کا جھوٹ کا عادی ہونا بیان کرنا منظور ہوتا ہے تو کہتے ہیں: ''زید جھوٹ بولتا ہے''۔

(ب) اور جب اُس کے کسی خاص مقولہ (بات) کی تکذیب مدِنظر ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ''زید جھوٹ کہتا ہے''۔ اور یہی امر محاورے کے زیادہ موافق ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اس موقع میں اُن لوگوں کا علیٰ العموم کاذب (جھوٹا) ہونا بتلانا منظور نہیں، بلکہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ [43] (جو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر) جو کہا کرتے تھے، جو اوپر مذکور ہے، اس مقولۂ خاص (خاص بات) کی تکذیب فرمانی منظور ہے۔ اور ''عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' نفاق کی سزا ہے، نہ کذب کی۔

فلِلّٰه درّہ ما الطف طبعهٗ، و أسلم ذوقهٗ، و أحدّ نظرهٗ

(اللہ ہی انھیں انعام دے کہ کس قدر اُن کی طبیعت میں لطافت ہے، اور اُن کا ذوق کتنا صاف ستھرا ہے۔ اور اُن کی نظر کتنی تیز ہے)۔

(مثال 10: مَا يَشْعُرُوْنَ اور لَا يَشْعُرُوْنَ کا فرق)

اور سنیے! ''مَا يَشْعُرُوْنَ'' (آیت: 5) اور ''لَا يَشْعُرُوْنَ'' (آیت: 12) جو ان آیات میں موجود ہے، چوں کہ ''يَشْعُرُوْنَ'' لفظ واحد ہے، اس لیے اُس کے ترجمے میں بھی کسی نے فرق نہیں فرمایا، مگر حضرت شاہ صاحبؒ بال کی کھال نکال کر اوّل کا ترجمہ ''نہیں بوجھتے'' اور دوسرے کا ترجمہ ''نہیں سمجھتے'' فرماتے ہیں۔ فرق کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ:

(الف) جہاں تامُّل (غور) اور فکر کی حاجت ہوتی ہے، اُس کے سمجھنے کو ''بوجھنا'' کہتے ہیں تو اس فرمانے سے ادھر اشارہ ہوگیا کہ امرِ اوّل یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دغا دینا، اس کے سمجھنے میں تامّل کی حاجت ہے۔

(ب) اور امرِ ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا ایسی کھلی بات ہے کہ ادنیٰ تامُّل کی حاجت نہیں۔

قاضی (ناصرالدین شیرازی) بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں ''لَا يَشْعُرُوْنَ'' اور ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' کا فرق ارشاد فرمایا ہے۔[44] شاہ صاحبؒ نے ایک لفظ ''يَشْعُرُوْنَ'' کو دو موقعوں پر بولنے سے بہ وجہ اختلافِ محل جو باریک فرق نکلتا ہے، اُس کی طرف لطیف اشارہ فرما دیا، جس سے فہمِ مطلب میں مدد ملتی ہے۔

(''موضحِ قرآن'' لفظی حوالے سے مفید ترجمہ اور معنوی طور پر ایک لطیف تفسیر)

اس کے بعد عرض ہے کہ ہم نے یہ چند نظائر چھوٹی بڑی جو شروع قرآن مجید کے کل صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے متعلق ہیں، بلاقصد ِاستیعاب ''موضحِ قرآن'' سے بہ طورِ نمونہ اور بہ غرضِ تنبیہ عرض کر دیے ہیں۔ اس کو دیکھ کر ترجمہ موصوف کی خوبی و لطافت اور اجمالی حالت معلوم ہوسکتی ہے۔ اور ہماری معروضاتِ سابقہ کی تصدیق بھی ان شاء اللہ بہ قدرِ کفایت سمجھ میں آسکتی ہے۔ باقی ترجمہ مذکور کا اوّل سے آخر تک ایک رنگ ہے۔ چناں چہ اہلِ علم وفہم پر روشن ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بروئے فہم و انصاف حضرت (شاہ عبدالقادر دہلوی) رحمہ اللہ نے حقیقت میں ایک مفید تفسیر تحریر فرمائی ہے، مگر ترجمے کے لباس میں:

(الف) اگر اُس کے الفاظ کو دیکھیں تو ایک سریعُ الفَھم (جلد سمجھ میں آنے والا) جچا تُلا ترجمہ نظر آتا ہے۔

(ب) اور معنی میں غور کیجیے تو ایک لطیف مفید تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

جس سے حضرت ممدوح کا بے نظیر کمال ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اُس کے برعکس بعض بلند خیال حضرات نے ''ترجمہ بہ لباسِ تفسیر'' لکھا ہے۔ جو حقیقت میں ترجمہ ہے، نہ تفسیر۔[45] پھر اُس پر طُرہ یہ کہ اُس نام کے ترجمے کو بڑھانے سے اور ''موضحِ قرآن'' کو گھٹانے سے، باوجود کثرت موانع ایک چیز بھی مانع نہیں ہوئی، مگر ''موشے بہ خواب آمد شتر شُد'' (خواب میں ایک چوہا آیا اور اونٹ بن گیا) سچ ہے۔ شعر ؎

گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد
بہ خود گمان نبرد ، ہیچ کس کہ نہ دانم [46]
(اگر رُوئے زمین سے عقل و دانش ختم ہوجائے
تب بھی ہر کوئی اپنے بارے میں یہ نہیں سمجھتا کہ: ''میں نہیں جانتا'')

باقی یہ ظاہر ہے کہ ترجمۂ موصوف (موضحِ قرآن) کے تمام فوائد چھوٹے بڑے کے بیان کرنے کی نہ حاجت اور نہ گنجائش، البتہ جو بات قابلِ تنبیہ ہوگی، اپنے موقع پر بالإجمال یا بالتّفصیل فوائد کے ذیل میں ان شاء اللہ عرض کر دیں گے اور اہلِ فہم کو ایک دو جز غور سے دیکھ لینے کے بعد اس قسم کے امور کے سمجھنے میں خود سہولت نظر آنے لگے گی۔

(''موضحِ قرآن'' کے مختلف نسخوں میں رد و بدل)

احتیاطاً یہ بھی عرض کیے دیتے ہیں کہ ''موضحِ قرآن'' کے مختلف نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بعض مواقع میں محاورہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھ کر:

www.rahimia.org

(الف) بعض نسخوں میں **بالقصد تصحیف** (اِرادی طور پر طباعتی غلطی) ہوئی ہے۔

(ب) اور بعض جگہ کسی لفظ کو غیر مانوس دیکھ کر دوسرا لفظ جو مناسب سمجھا، اُس کی جگہ بدل دیا ہے۔

مگر حضرت ممدوح کے لفظ کو بدلنا چوں کہ نظرِ سرسری کا کام نہیں، اس لیے ایسے الفاظ کی وجہ سے ''موضحِ قرآن'' میں یا ہمارے کسی تصرف میں کسی قسم کا خدشہ ٹھیک نہ ہوگا۔

(''موضحِ قرآن'' حاشیے میں لکھے گئے فوائد کی اہمیت)

فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرت —**حُجّةُ اللّٰہِ علیٰ العالَمین، و لِلعالَمین** — شاہ ولی اللہ —**قدّس اللّٰہ تعالیٰ سـرّہٗ** — نے جب اوّل قرآن شریف کا ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' بہ زبانِ فارسی تحریر فرمایا تو ضروری ضروری فوائد بھی اس پر اضافہ فرمائے، مگر بہت کم مواقع میں اور نہایت مختصر۔ جس سے عام اہلِ اسلام نفع اٹھانے میں قاصر ہیں۔

اس کے بعد حضرت شاہ (عبدالقادر دہلوی) صاحبؒ نے جب ''موضحِ قرآن'' اُردو میں ترجمہ کیا تو حضرت ممدوح نے فوائد کو بھی ایک کافی مقدار تک بڑھایا، جو نہایت کارآمد اور مفید ہیں۔ مگر سادہ بول چال اور مختصر الفاظ میں کہ بعض مواقع میں ہر کوئی بہ سہولت نہیں سمجھ سکتا۔ سو اس لیے اور نیز بہ وجہِ اختلافِ حاجت و مذاق اہلِ زمانہ اُن میں بھی زیادتی **کَـمّـاً و کیـفـاً** (مقدار اور کیفیت دونوں حوالے سے) مناسب اور مفید معلوم ہوتی ہے۔

(2۔ ترجمہ ''موضحِ فرقانِ حمید'' کی اصل نوعیت اور اہمیت)

امورِ متعلقہ ''موضحِ قرآن'' کے عرض کرنے کے بعد اب اپنی ناچیز ترمیم اور بے حقیقت کوشش کی حقیقت کہ جس کے مناسب درمناسب کسی کا یہ شعر دل سے بے تکلف زبان پر آتا ہے ع

مثال ہے میری کوشش کی یہ کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے (47)

گوش گزار ہے۔ اتنی بات تو پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ترمیم صرف دو امر میں ہوگی:

(الف) لفظِ متروک کو بدل دینا۔

(ب) حسبِ ضرورت اجمال و ابہام کو کھول دینا۔

اسی کے متعلق اتنا اَور عرض ہے کہ:

(الف) ہم نے جس موقع میں کوئی تصرف کیا ہے تو یہ نہیں کیا کہ اپنی رائے محض سے سرسری طور پر جو مناسب دیکھا، بدل دیا، یا بڑھا دیا، نہیں! بلکہ حضراتِ اکابر کے تراجم میں سے حتیٰ الوسع (الفاظ) لینے کی کوشش کی ہے:

(۱) خود ''موضحِ قرآن'' میں دوسرے موقع پر کوئی لفظ مل گیا۔

(۲) یا حضرت ممدوح کی اُردو کی تفسیر میں۔

(۳) یا حضرت مولانا شاہ رفیع الدین (دہلویؒ) کے ترجمے میں۔

(۴) یا (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ترجمہ) ''فتح الرحمٰن'' میں۔

www.rahmia.org

ان (مذکورہ بالا) میں سے (متبادل الفاظ) لینے کو پسند کیا۔

(ب) البتہ کچھ مواقع ایسے بھی ہیں کہ جہاں ہم نے کوئی لفظ اپنی طرف سے کسی ضرورت سے داخل کر دیا ہے، مگر جہاں ہم نے ایسا کیا ہے تو وہاں لفظ و معنی دونوں کا خیال رکھا ہے۔ یعنی:

(۱) لفظ سلیس اور محاورہ کے موافق ہو اور مطابقِ غرض اور مناسبِ مقام بھی ہو۔

(۲) اور اگر کہیں ایسا لفظ ہم کو ہاتھ نہیں آیا تو وہاں رعایتِ معنی کو ترجیح دی ہے۔ یعنی ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو موافق مراد اور مناسب مقام پورا ہو، گو اُس میں کچھ طول ہو یا ٹھیٹ محاورہ نہ ہو۔

(ج) اور جہاں ہم نے کسی وَجہ سے اصلی ترجمے کی ترتیب کو کچھ بدلا ہے یا اَور کوئی تغیر کیا ہے تو یہ ضرور خیال رکھا ہے کہ اُس کی نظیر حضرات اکابر — **رحمہم اللّٰہ تعالیٰ** — کے تراجم میں موجود ہو۔ ایسا تغیر جس کی نظیر تراجم موصوفہ (مذکورہ بالا) میں نہ ہو، ہم نے جائز نہیں رکھا۔

اتفاق سے اگر کوئی موقع ہماری اس غرض کے مخالف نظر آوے تو وہ یقیناً ہمارا سہو ہے یا خطا ہے، بالقصد جان بوجھ کر ہم نے ایسا نہیں کیا۔

(ترجمہ ''موضحِ قرآن'' میں ہمارے تصرفات اور تغیرات کی نوعیت)

یہ بات بھی عرض کر دینے کے قابل ہے کہ ''موضحِ قرآن'' کی عبارت میں جو ہم نے چھوٹے چھوٹے تصرفات کیے ہیں، وہ جگہ جگہ نظر آویں گے، مگر نہایت صغیر اور حقیر برائے نام۔ اور جس مصلحت کے لیے ترمیم کی گئی ہے، ان شاء اللہ اس کے موافق ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تغیرات موضح قرآن کی نسبت جو ہم اوپر عرض کر آئے ہیں، وہ حال بعینہٖ ہمارے تصرفات کا سمجھنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ہماری تمام سعی کا مقصود تو یہی تغیر ہے۔ پھر اس کارِ خدمت میں کون متأمل ہوسکتا ہے۔ ہم جس قدر تغیر کریں گے، اپنی خدمتِ واجبہ بجالائیں گے۔ البتہ قابل لحاظ یہ ہے کہ ''موضح'' کی عبارت میں تغیر و تبدل یا زیادتی کیوں کی؟ اور کیسی کی؟ اور کتنی کی؟

بعض کلماتِ قرآنی کے ترجمہ اور مراد میں علمائے کرام کی رائے مختلف ہے اور بعض آیات کے مطلب میں باہم گفتگو ہے۔ سو ایسے موقع میں ہم نے علی العموم (عام طور پر) ''موضحِ قرآن'' کا اتباع کیا ہے۔ اتنی بات پر موضح قرآن کے ترجمے کو بدلنا پسند نہیں کیا، مگر شاذ و نادر کہ وہاں کسی خاص ضرورت اور مصلحت سے شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی متابعت اختیار کی ہے۔

(''موضحِ فرقان'' کے فوائد کی نوعیت)

فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ:

(الف) ''موضحِ قرآن'' کے جملہ فوائد کو لینے کا التزام کیا ہے، اِلّا **ماشاء اللّٰہ** کہ کسی وجہ سے کسی فائدے کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی۔

(ب) اور فوائد میں چوں کہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے، ترجمے کی طرح قید اور تنگی نہیں تو اس لیے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے اور تقدیم و تاخیر، اجمال و تفصیل وغیرہ کی پرواہ

نہیں کی۔

(ج) اور بہت سے فوائد بالاستقلال (مستقل طور پر) جو مفید نظر آئے، مختلف معتبر موقعوں سے لے کر بڑھا دیے۔

(د) اور حضرت ممدوح رحمہ اللہ کی تقلید کے باعث اگرچہ ترجمے میں کہیں قدرے تنگی رہ گئی تو اُس کے بدلے میں مکافات (بدلے) سے بھی زائد فوائد میں اُس کی توضیح کردی ہے ع

ہر سخن وقتے ، و ہر نکتہ مکانے دارد

(ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر نکتے کے بیان کی ایک جگہ ہوتی ہے)

یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا مبلغِ سعی صرف ترجمہ موصوف کی خدمت گزاری ہے، جو سب کو معلوم ہے۔ اور یہ بات بھی روشن ہے کہ اتنی بات سے کہ ترجمہ موصوف میں ہم نے کچھ الفاظ — وہ بھی اکثر اِدھر اُدھر سے لے کر شامل کردیے — اس ترجمے کو ہماری طرف سے منسوب کرنا' اس سے زیادہ نہیں کہ دوشالہ میں کمبل سے رَفو کرکے اُس کو کمبل کہنے لگیں۔ بہت سے بہت وہ دو چار مٹھی الفاظ ہماری طرف منسوب ہوسکیں و بس۔

سو اس لیے ترمیم کے بعد اس ترجمے کا مستقل دوسرا نام تجویز کرنا ہرگز مناسب نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ کہیں کچھ الفاظ شامل کرنے سے یہ مستقل دوسرا (ترجمہ) نہیں ہوگیا، لیکن صرف **رفع اشتباہ** اور **دفع التباس** (دونوں کو ایک سمجھنے کے شبہ کو دور کرنے) کی ضرورت سے خیال ہوتا ہے کہ اصل ترجمے کے نام کے سوا اس کا بھی کوئی نام مخصوص ہو تو اختلاط و التباس سے پورا بچاؤ رہے گا۔ سو ''موضحِ قرآن'' کی مناسبت سے اس کا نام ''موضحِ فرقان'' مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر موضح قرآن میں یہ خوبی زائد ہے کہ تاریخی (۱۲۰۵ھ) بھی ہے۔ ''موضحِ فرقان'' تاریخی نہیں، ہاں! (اعداد میں) گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد تاریخی ہوسکتا ہے۔ قطعہ:

یادِ گارِ شہ عبد القادر ترجمہ موضحِ قرآن مجید
وہ کہ آں مجمعِ صد خوبی را کردہ ترمیم **اقلّ العبید**
بے شش و پنج بہ گفتہ محمود سالِ اُو ''موضحِ فرقانِ حمید''
۶ ۳ ۳ ۱ ھ

(شاہ عبدالقادر (دہلوی) کا یادگار ترجمہ ''موضحِ قرآن'' مجید ایسا ہے کہ جس میں سو خوبیاں جمع ہیں۔ ایک حقیر بندے نے اس میں ترمیم کی ہے۔ محمود نے بے ساختہ کہا کہ اس کا نام ''موضحِ فرقانِ حمید'' (۱۳۳۶ھ) ہے۔)

واجب الاظہار (ترجمے کے حوالے سے چند لازمی باتوں کا اظہار)

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ:

(1) مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے ربّ کو پہچانیں اور اُس کی صفات اور اُس کے احکام کو معلوم کریں اور تلاش کریں کہ حق تعالیٰ کون سی بات سے خوش ہوتا ہے اور کون سی بات پر غصہ ہوتا ہے، اور اُس کی خوشی کے کاموں کو کرنا اور ناخوشی کے کاموں

سے بچنا' اسی کا نام بندگی ہے اور جو بندگی نہ کرے، وہ بندہ نہیں۔

(2) سب جانتے ہیں کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے، سب چیزوں سے ناواقف اور انجان ہوتا ہے۔ پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے اور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کا پہچاننا اور اُس کی صفات اور احکام کا جاننا بھی سکھلانے اور بتلانے سے آتا ہے، لیکن ان باتوں کو جیسا حق تعالیٰ نے اپنے کلام میں خود بتلایا ہے، ایسا کوئی نہیں بتلا سکتا اور جو اثر اور برکت اور ہدایت حق تعالیٰ کے کلامِ پاک میں ہے، وہ کسی کے کلام میں نہیں۔

(3) اس لیے عام و خاص اہلِ اسلام پر لازم ہے کہ اپنے اپنے درجے اور لیاقت کے موافق کلام اللہ کے پڑھنے اور سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں۔ قرآن شریف کے اوپر کے درجے کے مطالب اور خوبیاں تو عالموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں، مگر جو لوگ علمِ عربی سے ناواقف ہیں، اُن کو بھی کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ علمائے دین نے جو صحیح اور سلیس ترجمے اُن کی زبان میں کردیے ہیں، اُن کے ذریعے سے اپنے معبود کے مقدس کلام کے سمجھنے میں غفلت اور کم ہمتی نہ کریں۔ اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہیں کہ بڑی بدبختی اور خسارے کی بات ہے۔

(4) مگر اس میں یہ اندیشہ ضرور ہے کہ صرف فارسی خواں یا اُردو داں — جو کلامِ عرب سے ناواقف ہے — اُردو ترجمے کو دیکھ کر کچھ کا کچھ سمجھ جائے۔ کیوں کہ:

(الف) پچھلی بات کا پہلی بات سے ملنا' یا جدا ہونا اکثر مواقع میں بدوں بتلائے ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا۔

(ب) ایسے ہی کسی مضمون مجمل اور مبہم میں غلطی ہوجانی ناواقف سے بعید نہیں۔

(ج) حتیٰ کہ بعض جگہ ضمیر کے مرجع میں غلطی کھا کر خرابی میں پڑنے کا ڈر ہے۔

(د) اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ کلام اللہ کے معنی بدونِ سند معتبر نہیں۔ سلف صالحین حضرات صحابہ و تابعین — رضوان اللّٰہ تعالیٰ علیهم أجمعین — کے مخالف کلام اللہ کے معنی لینے سراسر جہل اور گمراہی ہے۔ اللہ سب کو اس سے بچائے۔

سو اِن وجوہ سے لازم ہے کہ اُستاد سے سیکھنے میں کاہلی (سستی) نہ کریں اور محض اپنی رائے سے کچھ کا کچھ سمجھ کر ثواب کے بدلے اللہ کا غصہ نہ کمائیں۔ و اللّٰہ و لیّ التّوفیق و هو یهدی السّبیل (اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی سیدھے راستے پر پہنچانے والا ہے)۔

یہ مضمون حضرت شاہ (عبدالقادر دہلوی) صاحب کا ہے، جس کو کچھ تغیر اور تفصیل کے ساتھ ہم نے عرض کردیا ہے۔ کاش اہلِ اسلامِ ہند اس مفید مہتم بالشان ارشاد کا اتباع کرتے تو آج ترجمۂ ''موضحِ قرآن'' میں دِقت اور دُشواری کی شکایت نہ فرماتے۔ ؎

تا کَے ملامتِ مژۂ اشک بارِ من
یک بار ہم نصیحتِ چشمِ کبودِ خویش (48)

(تم کب تک میری آنسو بہانے والی پلک کی سلامتی چاہو گے
ایک بار تو اپنی نیلگوں آنکھوں کو بھی نصیحت کرو)

بلکہ جو حضرات ترجمہ موصوف کے سمجھنے میں آج سست نظر آتے ہیں، وہ دوسروں کے سمجھانے میں چست دکھلائی دیتے۔ حضراتِ علما کے نئے نئے ترجمے عام اہلِ اسلام کی نفع رسانی کی غرض سے شائع ہوتے رہتے ہیں، مگر بروئے انصاف باوجود کثرتِ تراجم عام طور پر ان کا نفع محسوس نہیں ہوتا۔ جب تک خود اہلِ اسلام ضروری اور مفید سمجھ کر اپنے شوق سے ترجمہ قرآن مجید کو سیکھنا اور سمجھنا نہ چاہیں گے، اس وقت تک صرف کثرتِ تراجم سے کیا نفع ہوسکتا ہے۔

بہ قول شیخ (سعدی) علیہ الرحمۃ۔ قطعہ:

فہمِ سخن تا نہ کند مستمع
قوتِ طبع از متکلم مجوئے
(جب تک سننے والا' بات کو نہ سمجھے
تو بولنے والے سے طبع آزمائی کا مطالبہ مت کر)

فُسحتِ میدانِ ارادت بہ یار
تا بہ زند مردِ سخن گوئے گوئے [49]
(یار کے ساتھ عقیدت کے میدان میں وسعت چاہیے
تاکہ مردِ سخن وَر اس میدان میں کھل کر کھیل سکے)

اور (قرآن پاک کا ترجمہ) شوقیہ اور اتفاقیہ دیکھ لینے سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

اسی ضرورت کی وجہ سے اہلِ علم اور خادمانِ اسلام کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ عام اور خاص دونوں طریقے سے اہل اسلام کو ترجمۂ قرآن اور فہم کلام الٰہی کی طرف متوجہ فرمانے کی نہایت ضرورت ہے۔ بلکہ اس کی بھی حاجت ہے کہ خاص ایسے سلسلے مختصر قائم ہوں کہ ہر کوئی اپنی حالت اور فرصت کے موافق اپنی ضرورت سہولت سے پوری کرسکے۔ اور معانی کلامِ الٰہی سے واقف ہوسکے۔ اور اسی طریقے سے جملہ احکامِ الٰہی کانوں تک تو پہنچ جائیں۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشاد کی بھی تعمیل ہوجائے۔ **و اللّٰہ الموفّق و المُعین. و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین.**

التماسِ اخیر

جملہ معروضات سے فراغت کے بعد عرض ہے کہ ترجمہ ''موضحِ قرآن'' کے **أحسن التّراجم** (تمام ترجموں میں سب سے بہتر ترجمہ) ہونے میں تو ان شاء اللہ اہلِ فہم کی طرف سے کسی تأمُّل اور تردّد کا اندیشہ نہیں، البتہ اس امر کا فکر ضرور ہے کہ اپنے حوصلے کے موافق بہ غرضِ نفع و اصلاح جو اُس کی خدمت گزاری کی ہے، خدا کرے وہ نادان دوست کی خدمت گزاری نہ ہو۔ سو اس لیے اہلِ علم انصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر ہماری خامہ فرسائی کا نتیجہ شائع ہوکر کسی وقت آپ حضرات تلک پہنچے تو ملاحظہ فرما کر جو اُمور قابلِ اصلاح سمجھے جائیں، اُن سے بے تکلف مطلع فرمائیں۔ (اس میں) دریغ (کوتاہی) نہ ہو۔

اور اگر کوئی صاحب ہماری ترمیم کی اصلاح فرمانے سے اس خدمت کو بالاستقلال انجام دینا زیادہ مفید سمجھیں تو وہ

بالاستقلال اس خدمت کو انجام دیں۔ ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ یہ بے نظیر ترجمہ جو اہلِ علم اور عوام دونوں کو مفید تر ہے، ایک سرسری عذر کی وجہ سے تقویمِ پارینہ نہ کر دیا جاوے۔ اور جس طرح اس کی تلافی اور تدارُک بہتر سے بہتر کر سکے، وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔ مصرعہ:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

تمّت

حواشی وحوالہ جات

1۔ تذکرۂ شیخ الہندؒ، مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوریؒ، ص:143، طبع: مجلس یادگار شیخ الاسلام کراچی، 2007ء۔

2۔ حیاتِ شیخ الہند، حضرت میاں سیّد اصغر حسین، ص: 236، طبع: ادارۂ اسلامیات، انار کلی، لاہور۔

3۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 329، طبع: دار القرآن، اردو بازار، لاہور۔

4۔ ایضاً، ص: 329۔

5۔ ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کا اصل مقدمہ بترجمۂ قرآن مجید''، مرتب: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، عرضِ مرتب، ص: 7 و 8، طبع: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، یو۔ پی، انڈیا، طبع: ربیع الاوّل ۱۴۳۷ھ / جنوری 2016ء۔

6۔ ایضاً، ص: 48-47۔ 7۔ ایضاً، ص: 44-43۔

8۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے کا آغاز نقشبندی سلسلے کے بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی حمدِ باری اور نعتِ مصطفیٰ سے کیا ہے۔ یہ مثنوی کے ابتدائی پانچ اشعار ہیں۔ (دیکھئے! دیوان مرزا مظہر جانِ جاناں وخریطۂ جواہر، مثنوی، ص: 85، طبع: در مطبع مصطفائی واقع کانپور، ۱۲۷۱ھ)

9۔ ''آزادی پسند صاحبوں'' سے مراد وہ حضرات ہیں، جنھوں نے قرآن حکیم کے تراجم میں بڑی بے احتیاطی کی ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام ڈپٹی نذیر احمد (ولادت: 6/دسمبر 1836ء۔ وفات: 3/مئی 1912ء) کا ہے، جنھوں نے ''قرآن مجید مترجم'' کے نام سے ۱۳۱۴ھ / 1897ء میں قرآن حکیم کا اردو ترجمہ اور فوائد شائع کیے۔

10۔ اس سے مراد حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فارسی ترجمہ قرآن حکیم ''فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن'' ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ ترجمہ رمضان ۱۱۵۱ھ / دسمبر 1738ء میں کیا اور ۱۱۵۶ھ / 1743ء میں مولانا محمد امین ولی اللّٰہی کی کوششوں سے عام ہوا۔ اُردو ترجمے میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ ''موضح القرآن'' ہے، جسے انھوں نے ۱۲۰۵ھ / 1791ء میں تحریر فرمایا۔

11۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ (ولادت: ۵/رجب ۱۲۹۹ھ / 3/جون 1881ء، وفات: یکم/شعبان ۱۳۶۰ھ / 25/اگست 1941ء) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متوسلین میں سے تھے۔ آپؒ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے سرپرستان میں سے تھے۔ آپؒ نے ۱۴/صفر ۱۳۱۸ھ / 12/جون 1900ء کو میرٹھ میں ''خیر المطابع'' نامی مطبع کھولا تھا۔ آپؒ نے قرآن مجید کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا۔ متعدد تفاسیر و کتبِ معتبرہ سے اس پر مفید حواشی اور تفسیری فوائد لکھے۔ پھر اسے سب سے پہلے اپنے مطبع سے ۱۳۱۹ھ / 1901ء میں شائع کیا۔

12۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (ولادت: ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ / 19/ستمبر 1863ء۔ وفات: ۱۷/رجب ۱۳۶۲ھ / 20/جولائی 1943ء) نے قرآن حکیم کا اردو ترجمہ اور تفسیر ''بیان القرآن'' کے نام سے تحریر فرمائی تھی جو پہلی مرتبہ ۱۳۲۶ھ / 1908ء میں شائع ہوئی۔ جب کہ حضرت تھانویؒ نے اس ترجمے اور تفسیر میں نظرِ ثانی کر کے ترمیم و اضافے کے بعد اسے ''مکمل بیان القرآن'' کی صورت میں ۲۰/

شوال المکرّم ۱۳۵۳ھ / جنوری 1935ء کو اپنے مطبع ''اشرف المطابع'' سے دوبارہ شائع کیا تھا۔

13۔ وہ مخلصین جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے ترجمہ کرنے کا اصرار کیا ہے، اُن میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا اہم کردار ہے۔ چناں چہ حضرت میاں سیّد اصغر حسین ''حیاتِ شیخ الہند'' میں لکھتے ہیں: ''بعض اہلِ علم کی استدعا اور بہت مصالح سے اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ کی غایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا''۔ (حیاتِ شیخ الہندؒ، ص: 236)۔

14۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد ایسے محسن کُش اپنے ''قرآن مجید مترجم'' کے ''دیباچہ طبع اوّل'' میں لکھتے ہیں:
''اگر اصل عبارت عربی کی ترتیب کا لحاظ کیا جائے تو اُردو کی عبارت کا کیا حال ہوگا۔ یہ ہے وہ بڑی کمی جو مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے میں تو منہ باہر اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کے ترجمہ میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اور یوں زبان کے رد و بدل کو تو سو برس کی مدت بھی کم نہیں۔...... یہ نمونہ ہے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کی آزاد طبع زاد اُردو کا۔ اسی پر قیاس کرنا چاہیے ان کے ترجمے کو، جس میں چار و ناچار پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ...مگر بہ ایں ہمہ یہ ترجمہ اپنے وقت میں اور اپنی شان میں بے نظیر تھا، لیکن اُس کی بے ترتیبی اور اُس کے انقباض نے عوام کو وہ فائدہ نہ ہونے دیا، جس کی مترجم نے توقع کی تھی۔ لوگ اس کو بہ مجبوری پڑھتے ہیں، اس لیے کہ اس سے بہتر اَور کوئی ترجمہ نہیں، مگر جیسا کہ چاہیے، خوش نہیں ہوتے اور اکثر جگہ سے تو سمجھتے بھی نہیں۔ شوق سے پڑھنا شروع کرتے ہیں اور اُکتا کر چھوڑ دیتے ہیں''۔ (قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، از ڈپٹی نذیر احمد، ص: 9-8، طبع: شمسی پریس دہلی، طبع دہم: ۱۳۲۷ھ / 1909ء)

15۔ **رواه التّرمذی عن ابی سعید الخدری، قال: قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: ''من لم یشکر النّاس لم یشکر اللّٰه.'' (حدیث نمبر 1955، باب ماجاء فی الشّکر لمن أحسن إلیک.)**

16۔ **رواه ابن ماجه فی سننهٖ عن جابرٍ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: ''إذا لعن آخر هٰذه الاُمّة أوّلها فمن کتم حدیثاً فقد کتم ما أنزل اللّٰه.'' (حدیث 263، باب من سُئل عن علمٍ فکتمهٗ، کتاب السّنة و أخرجهٗ البخاری فی تاریخهٖ 2/1/180)**

17۔ **دیوانُ المتنبّی، لأبی الطّیب احمد بن الحسین بن حسن الجعفی الکندی اشتهر ب''المتنبّی''، قافیة الّام، ''و قال یمدح القاضی ابالفضل احمد بن عبدالله بن الحسین الانطاکی''،** ص: 501، طبع: مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

18۔ دیکھیے! مقدمہ موضحِ قرآن، ص: 740، طبع: الفاروق بک فاؤنڈیشن، لاہور۔

19۔ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ پیراگراف دراصل ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی اس عبارت کا جواب ہے، جس میں انھوں نے ''موضحِ قرآن'' کی اُردو فصاحت کو سوالیہ نشان بنایا تھا۔ ڈپٹی صاحب لکھتے ہیں: ''مولانا شاہ عبدالقادر اور مولانا شاہ رفیع الدین کے ترجمے زبان کے پرانے ہونے کی وجہ سے ایسے اُکھڑے اُکھڑے نہیں معلوم ہوتے، جیسے بے ترتیبیٔ الفاظ کی وجہ سے۔ یہ نہیں کہ ان بزرگوں کو بے ترتیبیٔ الفاظ کا علم نہیں ہوا، یا ان کے وقت میں ایسی بے ترتیب اُردو، فصیح سمجھی جاتی تھی، نہیں! یہ لوگ بہ جائے خود اُردو کے لیے سند تھے، مگر بات یہ ہے کہ ایک طرف ترتیبِ الفاظِ قرآن کا پاس اور دوسری طرف اُردو کی فصاحت، اُن کی دین داری نے اجازت نہ دی کہ ترتیبِ الفاظِ قرآنی کے مقابلے میں اُردو کی فصاحت کا پاس کریں''۔ (قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، از ڈپٹی نذیر احمد، ص: 9)

20۔ مقدمہ موضحِ قرآن، ص: 740، طبع: الفاروق بک فاؤنڈیشن، لاہور

21۔ شاعر: مولانا مصطفیٰ علی خان خوش دل، بحوالہ کتاب: شمع انجمن از سیّد صدیق حسن خان، ص: 144، در رئیس المطابع، شاہجہانی گلی، گونۂ حسن انطباع، بر مارولید

22۔ بوستان سعدی، از حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ، مترجم: مولانا قاضی سجاد حسین، ص: 7، ناشر: سب رنگ کتاب گھر، دہلی۔

23. **البقرہ: 216۔** 24۔ **یوسف: 33۔**

25۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دعائے یوسفؑ کی قبولیت سے متعلق اس ارشاد کا پس منظر وہ ہے، جسے حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے ''نقشِ

حیات میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں:

''محرم ۱۳۳۵ھ (نومبر 1916ء) کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظّمہ عبداللہ سراج کی طرف سے ''نقیب علمائے مکہ'' عصر کے بعد آیا اور کہا کہ: ''مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرا دو''۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا ''مِن علماء مكّة المكرّمة المدرّسين بالحرم الشّريف المكّي'' (مکہ مکرمہ کے علما کی جانب سے، جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر' اس بنا پر کی گئی تھی کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریفِ (مکہ) حسین کی بغاوت کو حق بہ جانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا، اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ۔ حضرتؒ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ: ''چوں کہ یہ محضر اُن علمائے مکہ مکرمہ کی طرف سے ہے، جو کہ حرم میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرمِ مکی میں مدرّس بھی نہیں ہوں، اس لیے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے''۔ وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ: ''پھر کیا کِیا جائے، نہ عنوان اجازت دیتا ہے، نہ مُعَنْوَن (محضر کے مضمون میں)۔ مُعَنْوَن میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں، وہ سراسر خلافِ شریعت ہیں''۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ: ''فوراً مولانا محمود حسن اور اُن کے رفقا اور سیّد ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو''۔ (نقشِ حیات، از مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، جلد دوم، ص: 232، طبع: مکتبہ دینیہ، دیوبند)

حضرت شیخ الہندؒ کو جس غلط فتوے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا تھا، حضرتؒ نے اُس سے انکار کر کے جیل جانے کو پسند کیا۔ جیسا کہ عورتوں کی طرف سے گناہ کی دعوت دینے پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل جانا پسند کیا تھا۔ (مرتب)

26۔ معدنِ یواقیتِ زواہر یعنی خریطۂ جواہر، مجموعہ منتخب اشعار مرزا قلی میلےؔ، ص: 146۔ 27۔ یوسف: 100۔

28۔ اس حوالے سے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں:

''یہ حضرات کون تھے اور کس کی فرمائش پر یہ بڑی خدمت انجام دی گئی؟ حضرت شیخ الہندؒ کے مقدمہ یا کسی اَور تحریر میں وضاحت نہیں ہے، لیکن [شیخ الہندؒ کے معتمد سوانح نگار] مولانا سیّد اصغر حسین صاحب نے صراحت کی ہے کہ یہ فرمائش اور اصرار کرنے والے مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ تھے۔ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا عمومی تعارف ایک بڑے عارف اور نامور مرشد کا ہے، لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ حضرت مولانا رائے پوریؒ علومُ القرآن کے بہت بڑے فاضل، تراجمِ قرآن کے خاص ماہر، محقق، مبصر اور بڑے شناور تھے۔

مولانا رائے پوریؒ کو قرآن کریم کی تعلیم، اس کے مکتب بستی بستی قائم کرنے، قرآن کریم کے الفاظ و مطالب کو ہر اِک مسلمانوں تک پہنچانے کا غیر معمولی شغف تھا۔ قرآن کریم کی توسیع و تعلیم اور اس کا پیام عام مسلمانوں تک پہنچانے کی فکر میں ہمیشہ مصروف اور بے چین رہتے تھے۔ مولانا رائے پوریؒ کی ان ہی خدمات کا ایک اثر شیخ الہندؒ کا ترجمہ قرآن بھی ہے۔ مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی نے لکھا ہے: ''بعض اہلِ علم کی استدعا اور بہت سے مصالح اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کی غایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا''۔ (سوانح شیخ الہند، مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندی، ص: 236، طبع: ادارہ اسلامیات لاہور، 1977) (شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کا اصل مقدمہ ترجمہ قرآن مجید''، مرتب: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، ص: 9 تا 11)۔

29۔ دیوانِ خواجہ میر درد، ص: 9، طبع اردو مرکز بکی ماران، دہلی، 1958ء۔

30۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ لکھتے ہیں: ''اب کئی باتیں معلوم کِیا چاہیے:

(۱) پہلی یہ کہ اس جگہ معنی ہر لفظ کے جدا جدا ضرور نہیں، کس واسطے کہ محاورہ ہندی زبان کا اور عربی زبان کا ہرگز موافق نہیں۔ اگر جس طرح قرآن شریف میں ہے، اسی طرح جدا جدا لفظوں کے معنی لکھے تو ہرگز کسی کی سمجھ میں نہ آویں۔ اس واسطے آیت لکھ کر معنی لکھے ہیں۔

(۲) اور دوسری یہ کہ جو ہندی معنی آسان ہیں، ہر ایک سے پڑھے جاتے ہیں۔ پر اسے بھی اُستادی سند چاہیے کہ معنی قرآن شریف کے

بغیر سند کے اعتبار نہیں رکھتے۔

(۳) ملانا اگلی اور پچھلے آیتوں کے معنوں کو اور بات کا کٹ جانا بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن شریف عرب کی زبان میں ہے۔ وہاں کے لوگوں کو اپنی اپنی زبان کا محاورہ معلوم ہے۔ استاد کے محتاج نہیں۔ اور بہت بڑے معانی اور خوبیاں قرآن شریف کی جو بڑے عالم اور اللہ تعالیٰ کے لوگ سمجھتے ہیں، اس میں نہیں لکھیں۔ یہ ہندی زبان میں کم سمجھنے والوں کے واسطے آسان کرکے بیان کی ہیں۔ پر تب بھی بغیر استاد نہ سمجھا جاوے گا۔ (مقدمہ موضحِ قرآن، ص: 740)

31۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد اپنے ترجمے میں اختیار کرتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے محاورے کی پابندیوں کے حوالے سے ہونے والی مشکلات سے متعلق نمونے کا ایک چارٹ اپنے دیباچے میں دیا ہے، جس میں وہ اُردو محاورے کی وجہ سے الفاظِ قرآنی کی ترتیب میں ہونے والے تغیرات وتبدلات کی ایک پوری فہرست بیان کرتے ہیں۔ یہ نمونے کا چارٹ دینے کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''غرض! یہ چند مشکلیں جو واقع میں ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہیں، دوسرے مترجموں کو بھی پیش آئی ہیں۔ انھوں نے کہیں ہمارے مطابق، کہیں اپنے طور پر اُن کو رفع کیا ہے۔ غرض مترجم اپنی زبان کی پابندی کی وجہ سے (الفاظِ قرآنی میں) کچھ نہ کچھ تصرف کیے بغیر بدوں اچھا ترجمہ کر نہیں سکتا''۔ (چارٹ ملاحظہ فرمایئے! قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، ص: 16-15)۔

32۔ حضرت شیخ الہندؒ یہاں ڈپٹی نذیر احمد صاحب پر نقد کر رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے ''قرآن مجید مترجم'' کے دیباچے میں شاہ صاحبؒ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ان (حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ) کی دین داری نے اجازت نہ دی کہ ترتیبِ الفاظِ قرآن کے مقابلے میں اُردو کی فصاحت کا پاس کریں۔ ترتیبِ الفاظِ قرآن کا پاس اپنے اوپر لازم تو کیا، یہاں تک کہ وہ ''علٰی السّمـاء'' کا ترجمہ ''آسمان پر'' کی جگہ ''اوپر آسمان کے'' اور ''في الأرض'' کا ترجمہ ''زمین میں'' کی جگہ ''بیچ زمین کے'' کرتے ہیں، مگر ''من السّماء الیٰ الأرض'' کا ترجمہ ''سے آسمان تک زمین'' تو نہیں کر سکتے۔ ترجمہ تو ترجمہ، کثرت سے عربی کے پڑھنے نے اُن کے مذاقِ اُردو پر یہ اثر کیا تھا کہ باوجود یہ کہ ترجمہ نہیں، مگر الفاظ کی بے ترتیبی اُن کی اپنی اُردو میں بھی ہے''۔ (قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، ص: 9)۔

33۔ حضرت شیخ الہندؒ کا اشارہ اس جانب ہے کہ بامحاورہ ترجمہ بنانے کے شوق میں تقدیم وتاخیر کا دروازہ کھولنے کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں: ''ترجمہ ہونا چاہیے تھا سلیس، شگفتہ، مطلب خیز، بامحاورہ کہ ایک بار نظر ڈالو تو چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ صفحے کے صفحے اور ورق کے ورق پڑھتے چلے جاؤ اور طبیعت نہ گھبرائے۔ اصل قرآن کی سی فصاحت کا آنا تو محال ہے، مگر ''ما لا یُدرک کلّه لا یُترک کُلّه'' (جو چیز تمام وکمال حاصل نہ ہو سکے، اس کو بالکل ہی چھوڑ دینا بھی نہیں چاہیے)۔ جہاں تک ہو سکے اور جتنا ہو سکے۔ اب قرآن کی اور موجودہ ترجموں کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک حد درجے کا حسین آدمی ہے، مگر اُس کا لباس اُس کے حسن کے شایاں نہیں''۔ (قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، ص: 10-9)۔

34۔ دیوان غزلیات نظیری نیشاپوری، ص 34، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور، 1932ء۔

35۔ یہ اصل شعر اس طرح ہے ؎

روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامہ ای   من نیز حاضر مے شوم تصویرِ جانان در بغل

(شاعر: قدسی مشہدی، بحوالہ تذکرہ نشترِ عشق، تالیف: حسین قلی خان، ص: 1277، ناشر: میراث مکتوب، ایران)

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے جب ترجمۂ قرآن حکیم مکمل فرما لیا تو اس شعر کو قدرے تصرف کے ساتھ اس طرح اکثر ادا کیا کرتے تھے، جس سے اس شعر کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ موقع ومحل کے عین مطابق بھی ہے اور شاہ صاحبؒ کے دلی جذبات کا اظہار بھی۔ اسی شعر کو حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں نقل کیا ہے ؎

روز قیامت ہر کسے در دست گیرد نامہ ای   من نیز حاضر مے شوم ''تفسیرِ قرآں'' در بغل

36۔ الروم: 22۔   37۔ الانبیاء: 79۔   38۔ السّبا: 10۔

39۔ جیسا کہ ''تفسیر جلالین'' میں شیخ جلال الدین محلّی نے اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''الصّائرين إلىٰ التّقوىٰ بامتثال الأوامر و اجتناب النّواهي باتّقائهم بذٰلك النّار''. قال المحشّي: فسّرهم بذٰلك لئلّا يلزم اهتداءً للمتّقي''.
(تفسیر جلالین، ص: 4، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی)

40۔ الأنعام: 82۔ 41۔ لقمان: 13۔ 42۔ صحیح بخاری، حدیث: 4776۔ 43۔ البقرہ: 8۔

44۔ قاضی ناصرالدین بیضاویؒ لکھتے ہیں: ''و انّما فصّلت الآية ب'' لَا يَعْلَمُوْن'' و الّتي قبلها ب''لَا يَشْعُرُوْن''، لأنّه اكثر طباقا لذكر السّفه، و لأنّ الوقوف علىٰ أمر الدّين و التّمييز بين الحقّ و الباطل ممّا يتفقر إلىٰ نظر و فكر، و أمّا النّفاق و ما فيه من الفتن، و الفساد، فإنّما يُدرك بأدنى تفطّن و تأمّل فيما يشاهد ما أقوالهم و أفعالهم''. (تفسير البيضاوى المسمى أنوار التّنزيل و أسرار التّاويل، للقاضى ناصرالدين البيضاويؒ، سورة البقره، ج: 1، ص: 28، طبع: دارالكتب العلمية بيروت)
(سورۃ البقرۃ) آیت (اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ): میں ''لَا يَعْلَمُوْن'' بیان کیا ہے۔ اور اس سے پہلی آیت (اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْن) میں ''لَا يَشْعُرُوْن'' استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ سفاہت اور بے وقوفی کے ذکر کے ساتھ ''لَا يَعْلَمُوْن'' ہی مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس لیے کہ دین کے اُمور پر واقفیت اور حق و باطل میں تمیز کے لیے نظر و فکر کی ضرورت ہوتی ہے (جو علم کا نتیجہ ہوتا ہے)۔ اور جہاں تک نفاق اور اُس میں جو فتنہ و فساد پایا جاتا ہے، اُس کا اِدراک منافقین کے اقوال و افعال کے مشاہدے میں معمولی غور و فکر سے حاصل ہو جاتا ہے۔)

45۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد کا ''قرآن مجید مترجم'' کہ جس میں جگہ جگہ ترجمے کے دوران قوسین لگا کر تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ وہ خود لکھتے ہیں: ''ہم نے اپنی طرف سے جا بہ جا عبارتیں زیادہ کی ہیں اور امتیاز کے لیے اُن کو خطوطِ ہلالی میں محصور کر دیا ہے، مگر ہم نے جو عبارت اپنی طرف سے زیادہ کی ہے، اُس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے ترجمے کو تفسیر بنا دیا ہے۔ نہیں! ترجمہ ترجمہ ہی ہے۔ اور ایسی ہی ضرورت دیکھی تو کہیں توضیحِ مطلب کے لیے، کہیں محذوف یا مقدر کے اظہار کے لیے، کہیں تسلسلِ کلام کے لیے، کہیں کلامِ سابق اور لاحق کا تعلق دکھانے کے لیے اور کہیں تحسینِ ترجمہ کے لیے بھی عبارت بڑھائی ہے۔ اصل غرض یہ رہی کہ ترجمے کا پڑھنے والا قرآن کا نفسِ مطلب بہ خوبی سمجھ لے اور جہاں خطوطِ ہلالی سے بھی کام نہیں نکلا، تو ہم نے حاشیے پر فائدے لکھے ہیں''۔
(قرآن مجید مترجم، دیباچہ طبع اوّل، ص: 14-13)

حضرت شیخ الہندؒ نے اسی انداز و اُسلوب پر تبصرہ کیا ہے۔ (مرتب)

46۔ گلستان سعدی، از حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ، مترجم: مولانا قاضی سجاد حسین، ص: 220، ناشر: سب رنگ کتاب گھر، دہلی۔

47۔ اصل مقدمے میں یہ شعر اسی طرح طبع شدہ ہے۔ یہ شعر اصل میں مرزا غالب کا ہے اور دیوانِ غالب میں یہ شعر کچھ اس طرح ہے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

(دیوانِ غالب، نسخہ رضا، مرتبہ: کالی داس گپتا، ص: 389، ساکار پبلشرز، بمبئی، انڈیا، 1990ء)

48۔ مولانا شجاع کاشیؒ کا یہ شعر اس طرح ہے، جسے حضرت شیخ الہندؒ نے قدرے تصرف کے ساتھ تحریر کیا ہے، جو کہ برمحل ہے:

تا کے ملامت مژہ اشک بار من یک بار ہم نصیحتِ چشم سیاہ خود

(عرفات العاشقین و عرصات العارفین (ش-ظ)، ج: 4، مؤلفین: تقی الدین محمد و محمد قہرمان، ص: 2208، ناشر: میراث مکتوب، ایران)

49۔ گلستانِ سعدی، از حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ، مترجم مولانا قاضی سجاد حسین، ص: 75، ناشر: سب رنگ کتاب گھر، دہلی۔

☆

مطالعۂ تراجمِ قرآنیہ

تراجمِ قرآنیہ کا تنقیدی مطالعہ

حضرت شیخ الہندؒ کی ایک اہم یادداشت

تحریر: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
ترتیب وحواشی: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرۂ (م: ۱۸/ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ / 30/ نومبر 1920ء) نے ترجمۂ قرآن حکیم ''موضحِ فرقانِ حمید'' کے عنوان سے کیا تھا۔ اسے سب سے پہلے مولانا مجید حسن نے اپنے مطبع ''مدینہ پریس بجنور'' سے ۱۳۴۴ھ / 1923ء میں شائع کیا تھا۔ اس اشاعت میں انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی اس اہم قلمی یادداشت کی دستیابی کے بارے میں یہ نوٹ تحریر کیا تھا: ''حضرت شیخ الہندؒ کی یہ مختصر یادداشت مسوداتِ ترجمہ میں موجود تھی، جس سے فوائد پر ایک روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس کو بہ طورِ ''ضمیمہ مقدمہ'' کے شائع کیا جاتا ہے''۔ (مدینہ پریس بجنور)

اس یادداشت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے غالباً جب دیوبند میں ترجمہ قرآن حکیم کرنا شروع کیا تو مختلف اُردو تراجم کا ایک تنقیدی جائزہ لیا تھا، جیسا کہ حضرت اپنے ''مقدمہ'' میں بیان فرماتے ہیں: ''بعض احباب ومخلصین نے بندہ سے فرمایا کہ: اگر قرآن شریف کا ترجمہ سلیس ومطلب خیز اُردو زبان میں مناسب اور کارآمد اہلِ زمانہ ہوجاوے تو نہایت مفید ہے اور اس کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ جس کے دیکھنے سے ناظرین کو بہ سہولت نفع پہنچ سکے اور وہ خلل اور لفظی ومعنوی اَغلاط جو آزادی پسند صاحبوں کے ترجمے سے لوگوں میں پھیل رہی ہیں، اُن سے جو کوئی بچنا چاہے تو آسانی سے بچ سکے''۔ چناں چہ اس موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کے مطالعے میں ڈپٹی نذیراحمد کا ترجمہ بھی آیا۔ اس ترجمے کی کمزوریاں اور نقائص آپؒ پر واضح ہوئیں۔ اس میں بہت سی اَغلاط سامنے آئیں تو انھیں ایک یادداشت کے طور پر قلم بند کرلیا، تاکہ ترجمے کے وقت اُسے پیشِ نظر رکھا جاسکے۔

یہ تحریر ڈپٹی نذیراحمد کے ترجمہ قرآن کے آٹھ پارے تک کی آیات کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یادداشت دیوبند کے قیام میں دس پاروں کے ترجمہ تحریر کے زمانے کی ہے۔ آخری بیس پاروں کا ترجمہ مالٹا کی قید میں لکھا گیا۔ اس دوران غالباً دیگر تراجم پر تنقیدی مطالعے کا کام نہیں ہوسکا۔ البتہ مقدمہ ترجمہ قرآن حکیم کے اصل متن میں نام لیے بغیر دیگر ترجموں بالخصوص ڈپٹی صاحب کے ترجمے کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔ یہ تحریری مسودہ قرآنی ترجمہ نگاری سے متعلق اہم اُمور کی نشان دہی کرتا ہے۔ متن کے مشکل جملوں کی وضاحت ہم نے قوسین () میں کردی ہے۔ نیز جہاں تفصیلی وضاحت کی ضرورت تھی، اُس پر حاشیے میں تفصیل بیان کردی ہے۔ ڈپٹی نذیراحمد کے ترجمے ''قرآن مجید مترجم'' (مطبوعہ شمسی پریس دہلی، ۱۳۲۷ھ / 1909ء) کا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ مرتب)

حضرت شیخ الہندؒ کی ترجمہ قرآن سے متعلق اہم یادداشت

(سورۃُ الفاتحہ)

(1) بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ:

لغت میں تو یہ بات مسلّم ہے کہ ''الرَّحۡمٰن'' میں بہ نسبت ''الرَّحِيۡم'' مبالغہ زیادہ ہے، لیکن اس کے فرق کی طرف سوائے شاہ (عبدالقادر دہلوی) صاحبؒ، کسی نے اشارہ نہیں کیا۔ بعض مترجموں نے تو بالکل اُلٹا کردیا۔ [1]

شاہ صاحبؒ کا فرق ایسا دقیق تھا کہ اس کو کسی نے خیال نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے: ''جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا''۔ ہمارے ترجمہ میں اس کو خوب کھول دیا گیا۔ اور یہ ترجمہ کیا گیا: ''بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا''۔ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' دونوں کے مبالغہ کو ظاہر کردیا اور ''بے حد'' اور ''نہایت'' کے لفظ نے باہمی فرق بھی بتلا دیا۔

(2) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ! [سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: 1]:

''اَلۡحَمۡدُ'' کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب نے ''ہر طرح کی تعریف'' [2] کیا ہے، لیکن اس ترجمہ میں نہایت باریک نقص تھا۔ کیوں کہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ''ہر قسم کی تعریف'' اللہ کے واسطے ہیں۔ اس سے (اَلۡحَمۡدُ کا ''الف لام'' حمد کی تمام قسموں کی شمولیت سے) ''استغراقِ انواع'' ثابت ہوا، نہ کہ ''استغراقِ افراد'' (نہ کہ ہر ہر فرد میں موجود خوبی کی تعریف ہوئی)۔ اور استغراقِ افرادی (استغراقِ نوعی سے) بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اور (یہاں) وہی مراد بھی ہے۔

اس لیے اس ترجمہ کو چھوڑ کر یہ ترجمہ کیا گیا: ''سب تعریفیں اللہ کے لیے''۔ اس ترجمہ اور شاہ صاحبؒ کے ترجمہ [3] میں صرف الفاظ کے کم وبیش کا فرق ہے۔ امرِ مذکور کے ''فائدہ'' میں مضمون کو کھول دیا ہے۔ [4]

(3) مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ [سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: 3]:

مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کا ترجمہ بادشاہ [5] کا کیا ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ اس قرأۃ (نافع وغیرہ پانچ قراء) کے موافق درست ہو، جس میں ''مَلِکِ یوم الدّین'' ہے، مگر اس قرأۃ (امام عاصم اور امام کسائی کی قرأت یعنی مالِک یوم الدّین) کے موافق درست نہیں ہے (جو برصغیر میں رائج ہے)۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ [6]

(4) غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ [سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: 7]:

اس آیتِ شریفہ کا ترجمہ نہایت غور طلب امر ہے۔ تمام تفاسیر میں لکھا ہے کہ ''غَيۡر''، ''الَّذِيۡنَ'' کی صفت ہے، یا بدل ہے، لیکن تمام مترجموں نے اس کا خیال نہیں کیا، بلکہ خلافِ ترکیبِ لفظی یہ ترجمہ کیا ہے: ''نہ اس کی راہ''۔ البتہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ (''نہ وہ جن پر غصہ ہوا'') میں (صفت یا بدل) دونوں احتمال تھے۔

اس لیے تمام تراجم کے خلاف اس آیت کے ترجمہ کو تفاسیر کے موافق کردیا، اور فائدہ میں اصل مدعا کو کھول دیا ہے۔ [7]

(سورۃُ البقرہ)

(5) الٓمّٓ:

حروفِ مقطعات کے معانی میں مولوی نذیر احمد صاحب نے علما کے اوپر ''شخصی رائے'' کا الزام لگایا تھا، جس کے جواب کی طرف فائدہ میں اشارہ کیا ہے۔ (8)

(6) لَا رَيْبَ فِيْهِ [سورة البقرة، الآية: 7]:

اس آیت کے ''فائدہ'' میں بہت سے شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ (9)

(7) دو جگہ لفظ ''يَشْعُرُوْنَ'' [سورة البقرة، الآية: 9-12] وارد ہوا ہے۔

تمام مترجموں نے دونوں جگہ ایک ہی ترجمہ کیا ہے، یعنی ''نہیں سمجھتے''، البتہ شاہ صاحبؒ نے فرق کیا ہے، جو نہایت باریک ہے۔ وہ یہ کہ اوّل (وَمَا يَشْعُرُوْنَ) میں ''بوجھتے'' اور دوسرے (لٰكِن لا يَشْعُرُوْنَ) میں ''سمجھتے''، لیکن یہ فرق بہت مخفی تھا، اس کو ہمارے ترجمہ میں کھول دیا گیا ہے۔ (10)

(8) وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ الخ [سورة البقرة، الآية: 10]:

''يَكْذِبُوْنَ'' کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ نے ''جھوٹ بولتے تھے'' (11) کیا ہے اور شاہ صاحبؒ نے ''جھوٹ کہتے تھے''، لیکن صحیح ترجمہ یہی ہے، جو شاہ صاحبؒ نے کیا ہے۔ کیوں کہ یہ سزا مطلقاً جھوٹ بولنے کی عادت کی نہ تھی، بلکہ خاص اس جھوٹ کہنے کی کہ ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 8] یعنی نفاق کی ''بولنے'' اور ''کہنے'' میں باریک فرق ہے۔ اور فائدہ میں اس کو واضح کر دیا ہے۔ (12)

(9) يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ [سورة البقرة، الآية: 15]:

اس آیت کے ترجمہ میں نذیر احمد صاحب وغیرہ مترجموں نے سب نے غلطی کی ہے کہ ''فِيْ طُغْيَانِهِمْ'' کو ''يَعْمَهُوْن'' (13) کے متعلق کیا ہے (اور یہ ترجمہ کیا ہے: ''اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں پڑے ٹامک ٹوئیے مارا کریں'')، حال آں کہ اس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے (معتزلہ اللہ تعالیٰ کو خالقِ شر نہیں مانتے)۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اس (فِيْ طُغْيَانِهِمْ) کو ''يَمُدُّ'' کے متعلق کیا جاوے۔ اور جو مذہب اہل سنت کا ہے، اس کو ظاہر کر دیا جاوے۔ شاہ صاحبؒ کا ترجمہ (''اور بڑھاتا ہے اُن کو اُن کی شرارت میں بہکے ہوئے'' (14)) اسی طرح پر ہے اور ہمارے ترجمہ (''اور ترقی دیتا ہے اُن کو اُن کی سرکشی میں'' (15)) میں اس کو واضح کر دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے ''عَمِیَ'' (عَمًی: اندھا ہونا، دل کا اندھا ہونا اور جاہل ہونا) اور ''عَمَهَ'' (متحیر ہونا، گمراہی میں بھٹکنا) کے فرق کو بالکل اُڑا کر (''يَعْمَهُوْن'' جو کہ ''عَـمَـهَ'' مادہ سے ہے، کا) بے موقع ترجمہ کیا ہے۔ دیکھنے سے یہ فرق معلوم ہوگا۔

(10) فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ الخ [سورة البقرة، الآية: 16]:

اس کا ترجمہ (''سو نہ تو اُن کی تجارت ہی سودمند ہوئی اور نہ راہِ راست ہی پر قائم رہے''[16]) غلط کیا ہے۔

(حضرت شیخ الہندؒ نے صحیح ترجمہ یہ کیا ہے: ''سو نافع نہ ہوئی اُن کی سوداگری اور نہ ہوئے راہ پانے والے''[17])۔

(11) ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ [سورة البقرة، الآية: 17]:

مولوی نذیر احمد صاحب نے ''آنکھوں کا نور'' مراد لیا ہے[18]، حال آں کہ یہ درست نہیں ہے۔ (حضرت شیخ الہندؒ نے صحیح ترجمہ یوں کیا ہے: ''تو زائل کردی اللہ نے اُن کی روشنی''[19])

(12) فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ [سورة البقرة، الآية: 17]:

اس آیت میں (ڈپٹی نذیر احمد نے) ''فعل لازم'' کا ترجمہ (''پھر جب اس (شخص) کے آس پاس کی چیزیں جگمگا اُٹھیں'') کیا ہے،[20] حال آں کہ قرآن مجید میں ہماری قرأت (عاصم) ''فعل متعدی'' کی ہے (جیسا کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''پھر جب روشن کیا اُس کے گرد کو'')۔[21]

(13) يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ [سورة البقرة، الآية: 19]:

اس کے ترجمہ (''موت کے ڈر سے، مارے کڑک کے، اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں'') میں بلاداعی، تقدیم وتاخیر ایسی کی (بغیر کسی تقاضے کے جملوں کو ایسا آگے پیچھے کیا) کہ مطلب اُلٹا ہوگیا۔[22]

(جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ جملوں کی ترتیب کا لحاظ کرکے یوں کیا ہے: ''دیتے ہیں اُنگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے، موت کے ڈر سے''[23])۔

(14) وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا [سورة البقرة، الآية: 25]:

مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ (''ان کو ایک ہی صورت (شکل) کے میوے ملا کریں گے'') میں جنت کے تمام پھلوں کو ہم شکل بتایا ہے،[24] یہ احتمال مرجوح ہے۔ اس آیت پر ''فائدہ''[25] میں خوب تشریح کردی گئی ہے۔

(15) فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ [سورة البقرة، الآية: 26]:

اس (آیت) کے ترجمہ میں ''مِنْ رَّبِّهِمْ'' کو معطوف بنا دیا۔ اور محض خبط کیا۔

(چناں چہ ڈپٹی نذیر صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''وہ تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ (مثال بالکل) ٹھیک ہے (اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ) ان کے پروردگار (ہی) کی طرف سے (ہے)''۔[26]

(حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ کیا ہے: ''وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے، جو نازل ہوئی اُن کے ربّ کی طرف سے''[27])۔

(16) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ [سورة البقرة، الآية: 28]:

اس کا ترجمہ (''(لوگو!) کیونکر تم خدا کا انکار کرسکتے ہو''[28]) سب (ترجمہ نگاروں) کے خلاف اور غلط معلوم ہوتا ہے۔

(حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''کس طرح کافر ہوتے ہو خدا تعالیٰ سے، حال آں کہ تم بے جان تھے، پھر جلایا (زندہ

کیا) تم کو''[29])۔

(17) وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ [سورة البقرة، الآية: 35]:

(ڈپٹی نذیر احمد نے) ترجمہ "زوجه" کا ''بی بی''[30] کیا ہے، آگے جا کر ''مُحصِنه'' [31] کا یہی ترجمہ ہے۔

(جب کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ''موضح القرآن''[32] میں اور حضرت شیخ الہندؒ نے ''تیری عورت''[33] ترجمہ کیا ہے۔ اور ''مُحصِنه'' کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے ''نکاح بندھی عورتیں''[34] اور حضرت شیخ الہندؒ نے ''خاوند والی عورتیں''[35] کیا ہے)۔

(18) اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ [سورة البقرة، الآية: 37]:

غائب کا ترجمہ مخاطب کیا ہے۔[36]

(19) وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ [سورة البقرة، الآية: 41]:

اس (مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ) کا ترجمہ (حرفِ) ''عطف'' کے ساتھ کیا ہے۔

(ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ یوں ہے: ''اور اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو ہم نے (آپ) نازل فرمایا ہے، (اور وہ) اس (کتاب تورات) کی تصدیق کرتا ہے''۔[37] حرفِ عطف کے ساتھ ترجمہ کرنا غلط ہے۔ اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''مان لو اس کتاب کو جو میں نے اُتاری ہے سچ بتلانے والی ہے اُس کتاب کو جو تمھارے پاس ہے''[38])۔

(20) اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ [سورة البقرة، الآية: 68]:

(اس میں) بِكْرٌ کا ترجمہ ''بچھیا'' (گائے کا مادہ بچہ) کیا ہے۔

(ڈپٹی نذیر صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ''وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا''[39]۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''وہ گائے ہے نہ بوڑھی، نہ بن بیاہی''[40]۔ گائے کے مادہ بچے اور بن بیاہی گائے کے درمیان بڑا فرق ہے۔ مرتب)

(21) لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ [سورة البقرة، الآية: 78]:

اِلَّآ اَمَانِيَّ کے معنی مخدوش اور مرجوح لیے۔

(ڈپٹی نذیر احمد ترجمہ کرتے ہیں: ''جو (منہ سے لفظوں کے) بڑ بُرا لینے کے سوا کتابِ (الٰہی کے مطلب) کو (کچھ بھی) نہیں سمجھتے''[41]۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''خبر نہیں رکھتے کتاب کی، سوائے جھوٹی آرزوؤں کے''[42])۔

(22) فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ [سورة البقرة، الآية: 80]:

میں فاء کا ترجمہ ''اور'' کیا ہے۔

(ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کیا ہے: ''اور اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرے گا؟''،[43] جب کہ حضرت شیخ الہندؒ یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''کہ اب ہرگز خلاف نہ کرے گا اللہ اپنے قرار کے''[44])

(23) قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا [سورة البقرة، الآية: 93]:

کا ترجمہ ''ان لوگوں نے (گویا زبانِ حال سے) یہ کہا (ہم نے سنا تو سہی، ولیکن (ہم اس کو) تسلیم نہیں کرتے)''[45] کیا ہے۔ (جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''بولے ہم نے سنا اور نہ مانا''[46])۔

(24) فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ .. الخ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 97]:

''حال'' (یعنی مُصَدِّقًا) کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

(ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کیا ہے: ''یہ (قرآن) اُسی (فرشتے) نے خدا کے حکم سے تمھارے دل میں ڈالا ہے اور (قرآن) اُن (کتابوں) کی بھی تصدیق کرتا ہے جو اُس (کے زمانۂ نزول) سے پہلے (موجود) ہیں''[47]۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ''حال'' کا لحاظ کرتے ہوئے صحیح ترجمہ یوں کیا ہے: ''سو اس نے تو اُتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے کہ سچا بتلانے والا ہے اُس کلام کو، جو اس سے پہلے ہے۔''[48])۔

(25) يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى ... الخ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 132]:

''بَنِيَّ'' کا ترجمہ (بیٹا) مفرد کیا ہے،[49] (جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ''اے بیٹو'' ترجمہ کیا ہے)۔

پارہ (2) سیقول

(26) لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ ... الخ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 150]:

کو ''ترجمہ نذیریہ'' میں ''بار بار حکم دینے'' کو ''استقبالِ کعبہ'' کی علت بنایا ہے، جو غلط ہے۔

(ڈپٹی نذیر احمد نے آیت کے اس حصے کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''اور مسلمانو! تم بھی جہاں کہیں ہوا کرو نماز میں اُسی کی طرف اپنا منہ کرو (بار بار حکم دینے سے ایک) غرض یہ ہے کہ ایسا نہ ہو لوگوں کو تمھیں قائل کرنے کی سند ہاتھ آجائے، مگر اُن میں سے جو ناحق کی ہیکڑی کرتے ہیں (وہ تو تم کو الزام دیے بغیر رہنے کے نہیں) تو تم ان سے نہ ڈرو اور ہمارا ڈر رکھو!''[50]۔

جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے صحیح ترجمہ یوں کیا ہے: ''اور جس جگہ تم ہوا کرو، منہ کرو اُسی کی طرف، تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع، مگر جو اُن میں بے انصاف ہیں، سو اُن سے (یعنی اُن کے اعتراضوں سے) مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو!''[51])

(27) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ... الخ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 184]:

''فا'' کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ (ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کیا ہے: ''اس پر بھی جو شخص تم میں سے بیمار ہو''[52]۔ جب کہ حضرت شیخ الہندؒ اس کا صحیح ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر''[53]۔)

(28) وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ... الخ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 184]:

اس سے مسئلہ غلط بیان کیا ہے۔[54]

(29) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 185]:

(ڈپٹی نذیر احمد نے) اس کا ترجمہ (''(روزوں کا) مہینہ رمضان کا ہے، جس کے (روزوں کے) بارے میں خدا کی طرف سے قرآن (میں حکم) نازل ہوا ہے) بہت بے موقع کیا ہے، مگر ''تفسیرِ کبیر'' کا حوالہ دیا ہے۔[55]

(30) اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ [سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 186]:

کا ترجمہ (''جب کبھی کوئی ہم سے دعا کرے تو ہم (ہر ایک) دعا کرنے والے کی دعا کو سنتے اور (مناسب ہو تو) قبول بھی

کر لیتے ہیں'') غلط کیا ہے، (56) (جب کہ صحیح ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ نے کیا ہے کہ: ''قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے'' (57))۔

(31) ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاس [سورة البقرة، الآية: 199]:

کا ترجمہ (''پھر ایک بات یہ ہے کہ عرفات سے چلو تو اُس جگہ سے اور لوگ چلیں تم بھی وہیں سے چلو'') خراب کیا۔ (58) (جب کہ حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ یہ ہے: ''پھر طواف کے لیے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں'' (59) مرتب)۔

(32) لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ [سورة البقرة، الآية: 226]:

اس کے ترجمہ (جو لوگ اپنی بیبیوں پاس جانے کی قسم کھا بیٹھیں، ان کو چار مہینے کی مہلت ہے) اور ''فائدہ'' میں تعارض ہے اور مذہب کے بھی خلاف ہے۔ (60)

(33) فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (61) [سورة البقرة، الآية:249]:

''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ'' کا ترجمہ (''پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اُس کے ساتھ تھے، نہر کے پار ہو گئے'') اُلٹا کیا۔ ''مَعَهٗ'' کو ''اٰمَنُوْا'' کے متعلق کیا، ''جَاوَزَ'' کے (متعلق) نہیں کیا۔ (جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کی رعایت رکھتے ہوئے یہ ترجمہ کیا ہے: ''پھر جب پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اُس کے''۔ مرتب)

(پارہ 3) تلک الرّسل

www.rahimia.org

(34) اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ الخ [سورة البقرة، الآية: 259]:

کا ترجمہ (''(اے پیغمبر! کیا تم نے) مثلاً اُن بزرگ کے حال پر نظر نہیں کی، جو ایک بستی پر سے ہو کر گزرے'') بے ڈھنگا خلافِ محاورہ کیا ہے۔ (62)

(جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''یا نہ دیکھا تُو نے اُس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر پر'')۔

(35) فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ الخ [سورة البقرة، الآية: 259]:

اس کے ترجمہ (''پھر جب اُن (بزرگ) پر (قدرتِ الٰہی کا یہ کرشمہ) ظاہر ہوا تو بول اُٹھے کہ اب میں یقین (کامل) کرتا ہوں'') اور ''فائدہ'' میں اظہارِ خباثت معلوم ہوتا ہے۔ (63)

(36) قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ [سورة البقرة، الآية: 260]:

اس کا ترجمہ بے موقع ہوا ہے۔

(ڈپٹی نذیر احمد نے یہ ترجمہ کیا ہے: ''فرمایا: تو (اچھا) چار پرندے لو اور ان کو اپنے پاس منگواؤ اور بوٹی بوٹی کر ڈالو'') (64)

(جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''فرمایا: تو پکڑ لے چار جانور اُڑنے والے، پھر اُن کو ہِلا لے اپنے ساتھ'')۔ (65)

(37) فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا [سورة البقرة، الآية: 264]:
''صَلْدًا'' کا ترجمہ ''سپاٹ'' نادرست معلوم ہوتا ہے،
(ڈپٹی صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''پھر اُس پر برسا زور کا مینہ، اور اُس کو سپاٹ کر (کے بہہ بہا) گیا''۔ (66)
جب کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے: ''پھر برسا اس پر زور کا مینہ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف'' (67))

(38) وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ [سورة البقرة، الآية: 272]:
اس کا ترجمہ خبط سے خالی نہیں۔
(ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اور تم تو خدا ہی کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہو نا؟'' (68) حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''جب تک کہ خرچ کرو گے اللہ ہی کی رضا جوئی میں ......سو پوری ملے گی تم کو'' (69))۔

(پارہ: 8) و لو أنّنا

(سورة الأعراف)

(39) قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ [سورة الاعراف، الآية: 32]:
''فِي الْحَيٰوةِ'' کو غلطی سے ''اٰمَنُوْا'' کے متعلق کر دیا۔
(ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''تم ہی (ان کو) سمجھا دو کہ جو لوگ اس دنیا کی زندگی میں ایمان لائے ہیں، قیامت کے دن یہ نعمتیں خاص کر اُن ہی کو دی جائیں گی'' (70) جب کہ حضرت شیخ الہندؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''تُو کہہ کہ یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے ہیں، دنیا کی زندگی میں خالص انھیں کے واسطے ہیں قیامت کے دن'' (71))
(ڈپٹی صاحب کا ترجمہ سیاقِ آیہ ''قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ'' الآیہ سے بالکل غیر متعلق، بلکہ منافی ہے۔ مرتب)

حوالہ جات وحواشی

1۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کیا ہے: ''(جو) نہایت رحم والا، مہربان (ہے)'' (قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ الفاتحہ۔ ص: 6۔ طبع: شمسی پریس دہلی، طبع دہم: ۱۳۲۷ھ / 1909ء) اس ترجمے میں ''رحیم'' کا ترجمہ پہلے کر دیا اور ''رحمٰن'' کا ترجمہ بعد میں کر دیا۔ مرتب
2۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ الفاتحہ۔ ص: 6۔
3۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے: ''سب تعریف اللہ کو ہے''، موضح القرآن، ص: 2، طبع: تاج کمپنی، لاہور۔
4۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس پر جو فائدہ تحریر فرمایا ہے، وہ درجِ ذیل ہے:
''یعنی سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ، اوّل سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی، خدا ہی کو لائق ہیں۔ کیوں کہ ہر نعمت اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا وہی ہے۔ خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ، جیسے دھوپ کی وجہ سے اگر کسی کو حرارت یا نور پہنچے تو حقیقت

میں آفتاب کا فیض ہے۔شعر ؂

حمد را با تُو نسبتے است درست
بر در ہر کہ رفت بر درِ تُست

(حمد کو تیرے ساتھ درست طور پر نسبت ہے،
تیرے دروازے پر جو بھی گیا، وہ تیرے دروازے کا ہی فیض ہے)

تو اب اس کا (ڈپٹی نذیر کی طرف سے یہ) ترجمہ کرنا کہ ''ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے''، بڑی کوتاہی کی بات ہے، جس کو اہل فہم خوب سمجھتے ہیں''۔(موضح فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص:2، طبع: دارالقرآن، اردو بازار، لاہور)۔

5۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ترجمہ کیا ہے: ''روزِ جزا کا حاکم''۔ یہاں ''حاکم'' بادشاہ کے معنی میں ہے۔
(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ الفاتحہ۔ص:6)

6۔ اس لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے ''مالک انصاف کے دن کا'' ترجمہ کیا ہے۔

7۔ حضرت شیخ الہندؒ اس آیت پر فائدہ تحریر فرماتے ہیں: ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ'' الخ ''الَّذِيْنَ'' کا بدل ہے، یا اس کی صفت ہے۔اس لیے اس کے مناسب ترجمہ کیا گیا۔بعض تراجمِ دہلویہ (جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ) میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے، خلافِ ترکیب وخلافِ مقصود بھی ہے''۔(موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص:2)

8۔ اس آیت کے ذیل میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے الفاظ یہ ہیں:
''بعض مفسرین نے جو معنے تجویز کیے ہیں، وہ ان کی اپنی رائے ہے''۔۱۲ (قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص:7)
اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے یہ فائدہ تحریر فرمایا ہے: ''ان حروف کو ''مقطعات'' کہتے ہیں۔ان کے اصلی معنی تک اَوروں کی رسائی نہیں، بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور رسول کے درمیان۔جو بوجہ مصلحت وحکمت ظاہر نہیں فرمایا۔اور بعض اکابر (جیسا کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''الفوز الکبیر'' میں حروفِ مقطعات کے معانی بیان فرمائے ہیں، مرتب) سے جو ان کے معنی منقول ہیں، اس سے صرف تمثیل، وتنبیہ، و تسہیل مقصود ہے۔یہ نہیں کہ مرادِ حق تعالیٰ یہ ہے۔تو اب اس کو ''رائے شخصی'' کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے، جو تحقیقِ علما کے بالکل خلاف ہے''۔(موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص:3)

9۔ حضرت شیخ الہندؒ اس آیت کے فائدے میں تمام شبہات واعتراضات کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:
''یعنی اُس کے کلامِ الٰہی ہونے اور اُس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔جاننا چاہیے کہ کسی کلام میں اشتباہ ہونے کی دوصورتیں ہیں: (۱) یا تو خود اُس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو۔(۲) یا سننے والے کے فہم میں خلل ہو۔
اوّل صورت میں محلِ ریب (شک کا مقام) یہ کلام ہے۔اور دوسری صورت میں محلِ ریب (شک کا مقام) حقیقت میں سمجھنے والے کا فہم ہے۔کلام بالکل حق ہے، گو اس کو اپنی نافہمی سے وہ کلام محلِ ریب معلوم ہو۔سو اس آیت میں ''ریب'' کی صورتِ اوّل کی نفی فرمائی ہے۔تو اب یہ شبہ کہ ''کلام اللہ کے کلامِ الٰہی اور حق ہونے میں تو سب کفار کو ریب وانکار تھا، پھر اس نفی کے کیا معنی؟'' بالکل جاتا رہا۔باقی رہی صورتِ ثانی، اس کو آگے چل کر فرمادیا: ''وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ الآیہ'' (موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص:3)۔

10۔ حضرت شیخ الہندؒ نے پہلی آیت (وَمَا يَشْعُرُوْنَ) میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمے ''اور نہیں بوجھتے'' مزید کھول کر بیان کرتے ہوئے ''اور نہیں سوچتے'' کیا ہے۔اور دوسری جگہ (لٰكِن لَا يَشْعُرُوْن) ''پر نہیں سمجھتے'' کی وضاحت کرتے ہوئے ''لیکن نہیں سمجھتے'' ترجمہ کیا ہے۔مرتب۔

11۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ یوں ہے: ''اور اُن کو جھوٹ بولنے کی سزا میں عذاب دردناک (ہونا) ہے''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 8)

12۔ حضرت شیخ الہندؒ اس پر فائدہ تحریر فرماتے ہیں: ''اس جھوٹ کہنے سے وہی اسلام کا جھوٹا دعویٰ ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' مراد ہے، جو اوپر گزر چکا، یعنی ''عذابِ الیم'' حقیقت میں اُن کے نفاق کی سزا ہے، نہ مطلق جھوٹ بولنے کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو اسی باریک فرق کا متنبہ فرمانا منظور ہے، جو ''يَكْذِبُوْنَ'' کا ترجمہ ''جھوٹ بولنے'' کی جگہ ''جھوٹ کہنا'' فرماتے ہیں۔ **فجزاه اللّٰه ما ادق نظره**''۔ (موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 4)۔

13۔ اصل میں ترجمہ یوں ہے: ''اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں پڑے ٹامک ٹوئیے مارا کریں''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 9)

14۔ موضح القرآن از شاہ عبدالقادر دہلویؒ، ص: 5۔

15۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 5۔

16۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے لکھا ہے: ''سو نہ تو اُن کی تجارت ہی سودمند ہوئی اور نہ راہِ راست ہی پر قائم رہے''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 9)

17۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 5۔

18۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ یہ ہے: ''تو اللہ نے اُن کی آنکھوں کا نور سلب کرلیا'' (قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 9)۔

19۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 5۔

20۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 9۔

21۔ موضح القرآن، ترجمہ از حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، ص: 5۔

''تفسیرِ جلالین'' میں علامہ جلال الدین محلّیؒ نے ''اَضَآءَتْ'' کا ترجمہ ''أنارت'' کیا ہے۔ اس پر حاشیۂ ''جُمل'' میں یوں لکھا ہے: ''**أنارت: أشار به إلىٰ أنّ الفعل متعدّ، ففاعله ضميره مستتر، و ما الموصولة مفعولة أى أضاء ت النار المكان الّذى حوله، ف "ما" بمعنى المكان**'' (علامہ محلی نے ''اضائت'' کا ترجمہ ''انارت'' کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فعل متعدی ہے اور اس کا فاعل اس میں ضمیر مستتر اور ما موصولہ مفعولہ ہے۔ یعنی آگ نے اُس جگہ کو روشن کردیا، جو اُس کے اِردگرد تھا۔ چناں چہ ''ما'' مکان اور جگہ کے معنی میں ہے)۔ (تفسیر جلالین، ص: 5، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی)

22۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 9۔

23۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 5۔

24۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ یوں ہے: ''ان کو ایک ہی صورت (شکل) کے میوے ملا کریں گے''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 10)

25۔ حضرت شیخ الہندؒ اس آیت کی خوب وضاحت کرتے ہوئے اپنے تحریر کردہ ''فائدہ'' میں لکھتے ہیں:

''(احتمالِ اوّل) جنت کے میوے دنیا کے میووں سے شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے، مگر لذت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ (احتمالِ دوم) یا جنت کے میوے باہم ایک شکل وصورت کے ہوں گے اور مزہ جدا جدا۔ تو جب میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے: 'وہی قِسم ہے جو پہلے دنیا میں یا جنت میں کھا چکے ہیں'۔ اور چکھیں گے، مزہ اَور ہی پائیں گے''۔

(موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 6، فائدہ: 6)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے نزدیک اس آیت میں ''احتمالِ اوّل'' راجح ہیں، جب کہ ''احتمالِ دوم'' مرجوح ہے۔ (مرتب)

26۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 10۔

27۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 7۔

28۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 11۔

29۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 7۔

30۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 19۔

31۔ سورۃ النساء: 25۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، ص: 86۔

32۔ موضح القرآن، ترجمہ از حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، ص: 9۔

33۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 8۔

34۔ موضح القرآن، ترجمہ از حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، سورۃ النساء، ص: 132۔

35۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ النساء، ص: 105۔

36۔ غالباً ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کا جو نسخہ حضرت شیخ الہندؒ کے زیرِ مطالعہ ہے، اس میں ضمیر غائب کا ترجمہ غلطی سے ضمیر مخاطب سے ہوا ہے، البتہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا جو ترجمہ آج کل طبع ہو رہا ہے، اس میں ضمیر غائب کا ترجمہ صحیح ہوا ہے۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 19)

37۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 19۔

38۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 9۔

39۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 14۔

40۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 13۔

41۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 17۔

42۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 15۔

43۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 17۔

44۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 15۔

45۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 18۔

46۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 18۔

47۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 18۔

48۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 19۔

49۔ یہاں پر ڈپٹی نذیر احمد نے ایک ''فائدہ'' بھی لکھا ہے، جس میں مفرد ترجمہ کرنے کی ایک بے بنیاد وجہ یہ بیان کی ہے:

''بَنِیَّ اور بُنَیَّ دو لفظ ہیں اور دونوں لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ آئے ہیں۔ بَنِیَّ کا خطاب ہے کئی بیٹوں کی طرف اور اس کے لفظی معنی ہیں ''اے میرے بیٹو''، مگر اُردو کے محاورے میں کسی سے بھی خطاب کرنا ہو تو ''بیٹا'' ہی کر کے بولتے ہیں۔ اس لیے ہم نے بَنِیَّ کا ترجمہ ''بیٹا'' ہی کیا ہے۔ اور بُنَیَّ تصغیر کا صیغہ ہے اور مفرد بھی ہے اور تصغیر شفقت کی ہے۔ اور شفقت لفظ ''بیٹا'' سے ظاہر ہوتی ہے۔ یوں بَنِیَّ اور بُنَیَّ دونوں کا ترجمہ بیٹا کیا۔ بَنِیَّ کے ترجمے میں جمع چھوٹ گئی ہے اور بُنَیَّ میں تصغیر شفقت۔ مگر اردو پڑھنے والے کو یہ فرق معلوم رہے۔۱۲'' (دیکھئے! قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 23۔ طبع: شمسی پریس دہلی، ۱۳۲۷ھ / 1909ء)

بَـنِـيَّ میں جمع اور بُـنـيَّ میں تصغیر کا لحاظ کر کے صحیح ترجمہ نہ لکھنا اور صرف ''بیٹا'' بولنے کے محاورے کو بنیاد بنا کر ترجمہ کرنا ترجمہ نگاری کے اصول کے حوالے سے بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ ''بولنے'' اور ''لکھنے'' میں بہت فرق ہوتا ہے۔ نیز بولنے کے انداز سے بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ تبھی ڈپٹی صاحب کو اتنا لمبا چوڑا فائدہ لکھ کر ترجمہ پڑھنے والے کو مفرد ترجمے کا مطلب سمجھانا پڑا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اسی بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مرتب۔

50۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 26۔

51۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 28۔

52۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 31۔

53۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 34۔

54۔ یہاں پر ڈپٹی نذیر احمد نے تمام فقہا سے ہٹ کر یہ خود ساختہ مسئلہ بیان کیا ہے:

''مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مسلمان کو فرضی روزہ رکھنا چاہیے، مگر بیمار اور مسافر کو رُخصت ہے کہ رمضان میں روزہ نہ رکھے۔ بعد کو قضا کر لے۔ اور یہ دونوں (بیمار اور مسافر) مقدور والے ہوں تو قضا بھی نہ رکھیں، بلکہ روزے پیچھے ایک محتاج کا پیٹ بھر دیں۔ اور روزہ قضا بھی رکھیں۔ محتاج کا پیٹ بھی بھر دیں تو نـورٌ عـلٰی نورٌ اور روزے کے بدلے روزہ ہو۔ اور فضیلت رمضان جو فوت ہوگئی تھی، اس کی تلافی کے لیے محتاج کا پیٹ بھر دیا۔ اگرچہ بیماری اور سفر کی حالت میں مقدور والوں کو قضا کے بدلے فدیہ دینے کا اختیار دیا گیا ہے، مگر اُن کے لیے بھی روزہ قضا کا قضا کرنا ہو، تاکہ لوگ روزے سے بچنے کے لیے بہانے نہ ڈھونڈیں''۔

(دیکھیے! قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 31)

55۔ ڈپٹی صاحب اس پر ''فائدہ'' میں لکھتے ہیں: ''اکثر مفسرین نے ''اُنْزِلَ فِيْـهِ الْقُرْاٰن'' یہ معنی کیے ہیں کہ ماہِ رمضان میں قرآن کا اُترنا شروع ہوا، جیسا کہ پارۂ اخیر کی ''سورۃ قدر'' میں مذکور ہے، مگر جو معنی ہم نے اختیار کیے ہیں، تفسیر کبیر میں اس کا ماخذ موجود ہے۔ اور ہم کو یہی چسپاں معلوم ہے۔ ۱۲'' (قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 31)

احقر مرتب عرض کرتا ہے کہ: ''تفسیر کبیر'' میں ''اُنْزِلَ فِيْـهِ الْقُرْاٰن'' کی تشریح میں امام فخرالدین رازیؒ نے سب سے پہلے وہی مؤقف بیان کیا ہے، جو جمہور علما کا ہے کہ رمضان کے مہینے میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ پھر اس پر قائم ہونے والے سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا قول بیان کرتے ہوئے حضرت سفیان بن عیینہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

"قال سفیان ابن عیینة: " اُنْزِلَ فِيْـهِ الْقُرْاٰن: معنـاه أنزل فی فضله القرآن. و هٰذا اختیار الحسین ابن الفضل قال: و مثلـه أن يقـال: أنـزل فـی الصّدّیق كذا آية: يريدون فی فضله. قال ابن الانباری: انزل فی إیجاب صومه علیٰ الخلق القرآن، كما يقول: انزل الله فی الزكوٰة كذا و كذا يريد فی إیجابها. و أنزل فی الخمر كذا يريد فی تحریمها".

(حضرت سفیان ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ: ''اُنْزِلَ فِيْـهِ الْقُرْاٰن: اس کا معنی یہ ہے کہ رمضان کے مہینے کی فضیلت میں قرآن نازل ہوا۔ یہ قول حسین بن فضلؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس سے مراد اُن کی فضیلت کے بارے میں بات کرنا ہے۔ ابن الانباریؒ کہتے ہیں کہ مخلوق پر اللہ نے روزہ واجب کرنے کا حکم قرآن میں نازل کیا ہے۔ جیسا کہ کہا ہے کہ اللہ نے زکوٰۃ کے بارے میں یہ یہ چیزیں نازل کی ہیں۔ اس سے مراد زکوٰۃ کا واجب ہونا ہے۔ اسی طرح شراب کے بارے میں یہ نازل کیا، یعنی اُس کو حرام قرار دیا)۔

(التفسیر الکبیر، للامام الفخر الرازی، ج: 5، ص: 86-85، طبع: دارالکتب العلمیة طهران)

امام رازیؒ کی اس عبارت کو ملاحظہ کیجیے، جس کو ڈپٹی صاحب اپنے ترجمے کا ماخذ بیان کر رہے ہیں۔ اور پھر اُن کا یہ ترجمہ ''(روزوں کا)

مہینہ رمضان کا ہے، جس کے (روزوں کے) بارے میں خدا کی طرف سے قرآن (میں حکم) نازل ہوا ہے' ملاحظہ فرمائیں تو حضرت شیخ الہندؒ کی بات بہت خوبی سے سمجھ آتی ہے۔ یہ ترجمہ انتہائی بے موقع ہے۔ (مرتب)

56۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 32۔

57۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 35۔

58۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 35۔

59۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، سورۃ البقرہ، ص: 39۔

60۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس آیت پر یہ ''فائدہ'' لکھا ہے:

''قسم کے سلسلے میں ایک خاص طرح کی قسم کا تذکرہ فرمایا۔ جس کو اصطلاحِ شرع میں ''ایلاء'' کہتے ہیں کہ مرد نے عورت کے پاس جانے کی قسم کھائی، تو اس کو چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد رجوع کرے یا چار و ناچار طلاق دے''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، ص: 39)

ڈپٹی نذیر احمد نے ہر قسم کے لیے بلاتفصیل چار ماہ کی مہلت ذکر کی ہے اور اس مہلت کے بعد رجوع کرنے یا طلاق دینے کا ذکر کیا ہے، جو حنفی فقہ کی رائے کے برعکس ہے۔ اسی لیے حضرت شیخ الہندؒ اس آیت پر ''فائدہ'' تحریر فرماتے ہوئے صحیح مسئلہ لکھتے ہیں:

''فائدہ: ''ایلاء'' شرع میں اُس کو کہتے ہیں کہ عورت کے پاس جانے سے: (۱) چار مہینے (۲) یا زائد کے لیے (۳) یا بلا قید مدت قسم کھا لے۔ اور چار مہینے سے کم ''ایلاء'' نہ ہوگا۔ ''ایلاء'' کی (ان) تینوں صورتوں میں چار مہینوں کے اندر عورت کے پاس جائے گا تو کفارہ قسم کا دینا پڑے گا۔ ورنہ چار ماہ کے ختم پر بلا طلاق دیے عورت مطلقہ بائنہ ہو جائے گی۔

اور اگر چار مہینے سے کم پر قسم کھائے، مثلاً قسم کھائی کہ تین مہینے عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو یہ ''ایلاء'' شرعی نہیں۔ اس کا یہ حکم ہے کہ اگر قسم کو توڑا — مثلاً صورتِ مذکورہ میں تین مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا — تو قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ اور اگر قسم کو پورا کیا — یعنی تین مہینے تک مثلاً اُس کے پاس نہ گیا — تو نہ عورت پر طلاق پڑے گی اور نہ کفارہ لازم ہوگا''۔

(موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 45)

61۔ اصل میں ترجمہ یوں ہے: ''پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اُس کے ساتھ تھے، نہر کے پار ہو گئے''۔

(قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 45)

یہاں پر حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے حضرت شیخ الہندؒ کی بات پر نقد کرتے ہوئے ایک حاشیہ لکھا ہے:

''تنبیہ: شیخ الہندؒ نے یہاں پر یہ اعتراض کیا کہ ڈپٹی صاحب نے ''مَعَهٗ'' کو ''اٰمَنُوْا'' کے متعلق کیا، لیکن یہ بات درست نہیں ہے، بلکہ ڈپٹی صاحب نے ''مَعَهٗ'' کو ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کے متعلق کیا ہے۔ صرف ''اٰمَنُوْا'' کے متعلق کرنے سے فعل ایمان (ایمان لانے) میں معیت کا مطلب نکلتا ہے۔ اور ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کے متعلق کرنے سے صاحبِ ایمان کی معیت کا مفہوم نکلتا ہے، جیسا کہ مذکورہ ترجمہ اس پر دالّ ہے۔ ہاں! البتہ یہ بات درست ہے کہ ڈپٹی صاحب نے ''مَعَهٗ'' کو ''جَاوَزَ'' فعل کے متعلق نہیں کیا''۔

(دیکھیے! کتاب ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا اصل مقدمہ ترجمہ قرآن مجید''، مرتب: نور الحسن راشد کاندھلوی، ص: 189، ناشر: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، محلّہ مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی، انڈیا)

ہمارے خیال میں اس تنبیہ اور نقد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ ''الَّذِيْنَ'' اسم موصول کے بعد آنے والا جملہ اس کا صلہ ہے، اس جملے کے فعل ''اٰمَنُوْا'' کے ساتھ ہی ''مَعَهٗ'' جار مجرور متعلق کیا ہے۔ اسے ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' موصول صلہ کے ساتھ متعلق قرار دے کر ڈپٹی صاحب کا دفاع کرنا بڑا تعجب خیز ہے!!! حضرت شیخ الہندؒ کی بات بالکل واضح اور علمی حوالے سے بہت درست ہے۔ حضرت شیخ

الہندؒ کا منشا بھی یہی نظر آتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ''الَّذِيْنَ اٰمَـنُوْا'' کے ساتھ متعلق کیا ہے، ''جَاوَزَ'' کے ساتھ نہیں کیا۔ اور یہ ''جو اس کے ساتھ تھے'' کی ترکیب سے بالکل واضح ہے۔ مرتب۔

62۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 47۔

63۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس آیت پر یہ فائدہ لکھا ہے: ''مفسروں نے بستی اور شخص کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بخت نصر بیت المقدس کو آگ لگا کر اور شہر کو اُجاڑ کر بنی اسرائیل کو پکڑ کر لے گیا تھا۔ عزیر علیہ السلام اُس ویرانی کے وقت میں بیت المقدس پر سے ہوکر گزرے۔ اور ظاہر حال پر نظر کر کے اُن کو نا اُمیدی ہوئی۔ ع: ایسے اُجڑے کبھی بھی بستے ہیں؟ اللہ نے اُن کو اپنا نمونۂ قدرت دکھایا۔ ایک سو برس تک مرے پڑے رہے۔ پھر زندہ کیا تو بیت المقدس اتنے عرصے میں پھر آباد ہوگیا تھا۔ اور اُن کے گدھے کو اللہ نے اُن کی آنکھوں دیکھتے جِلا اُٹھایا۔ خدا نے اُن کے کھانے پینے کی حفاظت کی کہ وہ بُسا تک نہیں۔ عزیر علیہ السلام کو صرف یہ حیرت تھی کہ خدا خلافِ عادت قدرتوں کو کیونکر نافذ کرتا ہے۔

اور وہ بادشاہ (نمرود) جس نے ابراہیم علیہ السلام سے بحث کی تھی، اُس کو سِرے سے خدا کی قدرت ہی کا انکار تھا۔ عزیر علیہ السلام کو انکار نہ تھا، بلکہ تعجب تھا۔ انکار اور تعجب میں بڑا فرق ہے، مگر ہیں ملتے جلتے ہوئے۔ اسی واسطے خدا نے دونوں قصے ایک ہی جگہ بیان فرمائے۔ اور عزیر کے قصے میں کاف تشبیہ سے شروع کیا کہ اس بادشاہ کی سی بدعقیدتی نہیں ہے، مگر ہے اُسی کے لگ بھگ۔ اور یہ جو عزیر نے باوجودیکہ سو برس مرے پڑے رہے، ایک دن یا ایک دن سے بھی کم بتایا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ واقع میں مر گئے تھے۔ اُن کو دیر کا احساس ہی نہ تھا۔ اور یہی حال تو قیامت میں ہوگا کہ کافر دنیا اور عالم برزخ میں رہنے کی مدت کو اتنا ہی تھوڑا بتائیں گے۔ مگر قیامت کے دن مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا کہ تم کو (اس کا) یقین نہیں'' (قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ، ص: 47)۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ڈپٹی صاحب کے اس ''فائدہ'' کو ''اظہارِ خباثت'' کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حضرت عزیر علیہ السلام کی ''بادشاہ کی سی بدعقیدتی کے لگ بھگ'' کا تذکرہ ہے، حال آں کہ انبیا علیہم السلام یقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز اور معصوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیے کے ''فائدہ'' میں یہ وضاحت فرمائی ہے: ''حضرت عزیر علیہ السلام نے اس تمام کیفیت کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا کہ: ''مجھ کو خوب یقین ہوا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یعنی میں جو جانتا تھا کہ مردے کو جِلانا خدا تعالیٰ کو آسان ہے، سو اَب اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ یہ مطلب نہیں کہ پہلے یقین میں کچھ کمی تھی۔ ہاں! مشاہدہ نہ ہوا تھا''۔

(موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 55) مرتب۔

64۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 47۔

65۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 55۔

66۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 48۔

67۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 56۔

68۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 50۔

69۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 58۔

70۔ قرآن مجید مترجم، از ڈپٹی نذیر احمد، سورۃ البقرہ۔ ص: 163۔

71۔ موضحِ فرقانِ حمید، ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ، ص: 201۔

☆

www.rahimia.org

علمی لیکچرز

''پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل و تقاضے اور اُسوۂ حسنہ''

خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری

تاریخ: ۲۳؍ ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ/ 21؍نومبر 2019ء، بروز جمعرات۔ مقام: آئی ایم ایس ہال، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

(چند سال قبل ملک کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مدظلہٗ مسئول موسیٰ پاک چیئر اور شعبہ علومِ اسلامیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کو شعبۂ اسلامیات میں لیکچر کی دعوت دی۔ چناں چہ سب سے پہلے انھوں نے مؤرخہ 3؍ نومبر 2016ء کو شعبہ علومِ اسلامیہ کے سیمینار ہال میں ''اسلام اور عدلِ اجتماعی'' کے عنوان پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کے بعد اپریل 2017ء میں حضرت آزاد رائے پوری نے ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر خطبات کی ایک لیکچر سیریز دی تھی، جس میں درجِ ذیل موضوعات پر چار لیکچرز دیے گئے تھے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف
2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین
3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات
4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت

یہ تمام لیکچرز اپنی اہمیت کے سبب آڈیو ریکارڈنگ سے تحریری صورت میں قلم بند کیے گئے۔ پھر نظرِ ثانی، ذیلی عنوانات اور حوالہ جات کی تخریج کے بعد یہ علمی سرمایہ ''شعور و آگہی'' کے گزشتہ شماروں میں پیش کیا جاچکا ہے۔

۱۴۴۱ھ کے ربیع الاوّل کے مہینے میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز نے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے اشتراک سے نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ''پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل و تقاضے اور اُسوۂ حسنہ'' کے عنوان سے مؤرخہ ۲۳؍ ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ/ 21؍نومبر 2019ء، بروز جمعرات کو ایک لیکچر کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر سب سے پہلے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) کے تعارف کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمد مختار حسن مدظلہٗ کا تعارفی خطاب ہوا۔ اس کے بعد حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مذکورہ بالا عنوان پر لیکچر دیا۔ آخر میں سوال و جواب پر مشتمل تفصیلی نشست ہوئی۔ پھر حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مدظلہٗ نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ سٹیج پر حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہٗ بھی رونق افروز تھے۔ لیکچر کے اختتام پر ڈاکٹر زبیر احمد استاد آئی ایم ایس و انچارج پروگرام نے معزز مہمانوں کی خاطر تواضع کی اور ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

اس شمارے میں یہ لیکچر ترتیب و تدوین کے بعد قارئین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان لیکچرز سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ادارہ)

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ؛ ایک تعارف

از حضرت مولانا مفتی محمد مختار حسن

الحمد للّٰہ و کفٰی و سلام علٰی عبادہٖ الّذین اصطفٰی، أمّا بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ، صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ (1) آمین صدق اللّٰہ العظیم.

جناب صاحبِ صدر ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعوان صاحب، ہمارے مہمانِ خصوصی حضرت اقدس مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ العالی ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ)، جناب مفتی عبدالمتین نعمانی صاحب صدر ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ اور میرے عزیز دوستو!

یہ پروگرام ادارہ رحیمیہ اور آئی ایم ایس ڈیپارٹمنٹ کے تعاون سے منعقد ہو رہا ہے۔ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) بنیادی طور پر ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ کوئی بھی ادارہ اپنے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہمارے اس ادارے کا نام اس نسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس خطے میں شعور اور بیداری کی جو پہلی تحریک اُٹھی ہے، اس کے سرخیل حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن سے پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جس درس گاہ میں تربیت پائی، شعور حاصل کیا اور اس کے نتیجے میں اعلیٰ درجے کے مجدد بنے، اُس کا نام ''مدرسہ رحیمیہ'' تھا۔ ان کے والدِ محترم حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے نام سے یہ مدرسہ موسوم تھا۔ ہماری نسبت انھیں بزرگوں کے ساتھ ہے۔ اور اسی حوالے سے ہم چاہتے ہیں کہ آج کے دور میں قرآن وسنت کی تعلیمات ان مجددین کے افکار کی روشنی میں سمجھی جائیں اور نوجوانوں میں شعور اور بیداری پیدا کی جائے۔

درس گاہ کی مرکزیت کے بغیر تربیت ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت میں جب ہم پاکستان کی صورتِ حال دیکھتے ہیں تو پاکستان میں تعلیم کے عنوان سے مختلف ادارے موجود ہیں۔ کچھ ادارے وہ ہیں، جو عصری تعلیم دیتے ہیں، کالجز اور یونیورسٹیز ہیں اور کچھ ادارے وہ ہیں، جو دینی تعلیم دیتے ہیں۔ سوسائٹی میں یہ دو بہت بڑے ذہن ہیں۔ جو دینی ادارہ ہے، وہ عصری علوم سے واقف نہیں ہے اور جو عصری علوم کے ادارے ہیں، وہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے آشنا نہیں ہیں۔ اس لیے سوسائٹی میں ہمیں ایک تقسیم ملتی ہے۔ ہم جس خطے میں رہتے ہیں، یہ ہزاروں سالوں سے مذہبی خطہ ہے۔ ہم کبھی بھی لامذہبی نہیں رہے۔ مذہب کے عنوان پر ہی ہم تعلیم حاصل کرتے رہے، جدوجہد کرتے رہے۔ اسی پر ہماری پرورش ہوئی ہے۔

یورپ کی طرف سے ایک پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ آج مسلمان ذلت اور ناکامی کا شکار اس لیے ہے کہ انھوں نے مذہب کو

اختیار کیا ہوا ہے۔ اور ہم نے ترقی اس لیے کی کہ ہم نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا۔ اب اگر مسلمان مذہب کو خیر باد کہیں گے تو ترقی کرسکیں گے، ورنہ نہیں کرسکیں گے۔ یورپ کا پس منظر تو یہ ہے کہ اس خطے میں جن نظاموں نے جنم لیا ہے، جو فلسفی آئے ہیں، انھوں نے لامذہبیت کی اساس پر اُن کو تعلیم دی، جب کہ ہمارا خطہ کبھی بھی لامذہبی نہیں رہا۔

دین اسلام وہ دین ہے، جس نے تاریخِ عالم میں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک انسانی معاشرے میں سب سے طویل مدتی اور سب سے وسیع نظام قائم کرکے انسانی مسائل کو حل کیا ہے۔ جب انسانیت زوال کا شکار تھی اور طبقات میں بٹی ہوئی تھی، فیوڈل لارڈز تھے، یورپ ڈارک ایج میں تھا تو اسلام عروج پر تھا۔ علم و شعور کے حامل لوگ عروج پر تھے، ہر شعبے میں تحقیقات ہو رہی تھیں۔ ہر شعبے میں ریسرچ کی مختلف میتھاڈالوجیز متعین کی جا رہی تھیں۔ تمدن کو تحفظ تھا۔ قوموں کو آزادی دلائی جا رہی تھی۔ امن تھا، خوش حالی تھی۔ ہزار بارہ سو سال تک ہم نے انسانیت کو امن اور خوش حالی دی، ترقی دی اور دنیا بھر میں جتنے علوم ہیں، ان کو محفوظ کیا۔ ان میں جو خامیاں تھیں، اُن کو دور کیا اور اُن علوم کو درست رُخ دے کر انسانیت کے مفاد میں ان کو استعمال کیا۔ اس لیے ہر قوم کے علوم، اُن کے تمدن کو محفوظ کرنا، اُن کو آزادی دینا، اُن کو امن دینا، اُن کو خوش حالی دینا، اُن کو ترقی دینا، یہ مسلمانوں کے مرہونِ منت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب نویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی تک یورپ ڈارک ایج میں تھا تو یہ مسلمانوں کی ہی یونیورسٹیاں تھیں، قرطبہ کی اور اندلس کی یونیورسٹیاں، جنھوں نے یورپ کو تعلیم دے کر جہالت سے، جاگیرداریت سے اور غلامی سے نکال کر اُن کو ترقی کا تمدن سکھایا۔

میرے محترم دوستو! آج ہمارے نوجوانوں کے سامنے بڑا سوال ہے کہ ایک طرف تو دنیا کی ترقی ہے اور دوسری طرف اُن کے بنیادی خمیر میں مذہب شامل ہے۔ اب مسلمان نوجوان کیا کرے؟ مغربی حوالے سے ترقی اختیار کرتا ہے تو مذہب چھوڑنا پڑتا ہے اور روایتی اور رسمی مذہب کی طرف جاتا ہے تو دنیا کی ترقی رُکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے دین اسلام کو اس کی حقیقی تعلیمات کی روشنی میں نہیں سمجھا۔ اگر ہم آج کے دور کے مجددین کی تعلیمات کے مطابق دین کا شعور اور اس کی بیداری پیدا کریں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ تو ہمیں دنیا چھوڑنی پڑتی ہے اور نہ ہمیں آخرت کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دین سے بیزاری غلط پروپیگنڈا ہے اور ہم تاریخ میں دیکھیں سب سے بڑے انقلابات، انسانی سماج میں شعور پیدا کرنے والے، انسانی علوم کو ترقی دینے والے، وہ سہولتیں، وہ چشمے دین سے ہی پھوٹے۔ اور اس کی بنیاد پر ہم نے ترقی کی ہے۔

ہمارا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) ایک ایسا دینی ادارہ ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کی اساس پر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اُن کی جماعت کے طرزِ فکر و عمل پر قائم کیا گیا۔ وہ ان حضرات کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے سماجی مسائل پر غور و تدبر کر کے نوجوانوں میں بیداری، شعور، اپنے سماجی اجتماعی مسائل کو حل کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اُس پر مکالمہ اور ڈیبیٹ کرواتا ہے کہ ہم اپنے مسائل کیسے حل کریں اور کیسے ترقی کی طرف آگے بڑھیں۔

میرے محترم دوستو! قومیں تب ترقی کرتی ہیں، جب اُن کے اندر قومی یونٹی پیدا ہو، ایک وحدت پیدا ہو۔ اور وحدت یقیناً ایک فکر سے پیدا ہوتی ہے۔ جو قومیں انتشار کا شکار ہوں، اُن کا کوئی قومی نصب العین نہ ہو، کوئی قومی نظریہ نہ ہو، اُن کو یہ علم نہ ہو کہ قومی اعتبار سے ہمارا دوست کون ہے، ہمارا دشمن کون ہے، ہمیں اس قوم کی قیادت اور انسانیت کی قیادت کے لیے کون سی انسانی

صلاحیتیں پیدا کرنی ہیں، کون سے اَخلاق اختیار کرنے ہیں۔ تو وہ قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ ہم اور آپ چوں کہ تعلیم سے وابستہ ہیں، تو میں تعلیم کے حوالے سے نشان دہی کرنا چاہوں گا کہ 72 سال گزرنے کے بعد بھی آج تک ہم اپنے قومی نظامِ تعلیم کو متعین نہیں کرسکے کہ ہم نے قوم کو تعلیم کیا دینی ہے؟ ہمارا ملک ایسا ہے کہ جس میں دنیا بھر کے نظامِ تعلیم اور نظریہ ہائے تعلیم رائج ہیں۔

یورپ اپنے نظریے سے تعلیم دے رہا ہے اور ہمارے کالجز اور یونیورسٹیز اُن سے تعلق رکھتے ہیں۔ امریکا اپنے نقطہ نظر سے یہاں پر تعلیم اور تربیت دینا چاہتا ہے۔ چائنہ اپنے نقطہ نظر سے تعلیم دیتا ہے۔ یہاں کی آرمی اپنا ایک نظامِ تعلیم رکھتی ہے۔ یہاں کے گورنمنٹ سکولز اور کالجز کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ اور غریب بچوں کے لیے وہ سکول اور کالجز ہیں، جو ٹاٹ سکول اور کالجز ہیں، جہاں پر غریب کا بچہ پڑھتا ہے۔ پھر دینی ادارے جو بالکل الگ تھلگ ہیں، ایک بالکل الگ دائرہ، فرقہ وارانہ بنیادوں پر تعلیم، اس میں بھی پانچ نظامِ تعلیم ہیں، جو فرقے کی بنیاد پر ہیں۔ کبھی بھی صالح تعلیم فرقے کی، علاقے کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ قومی، اجتماعی اور انسانی سوچ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان میں قومی اور انسانی اَخلاق پیدا کیے جاتے ہیں۔ قومی صلاحیتیں اُن میں پیدا کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے دین جو انسانیت کو رہنمائی دیتا ہے اور دین اسلام جو عالم گیر مذہب ہے، جس نے کل انسانیت کے مسائل حل کرنے ہیں، وہاں انسانیت کے بجائے دیوبندیت، بریلویت، شیعیت، اہل حدیث، مودودیت وغیرہ فرقوں کی بنیاد پر تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ہر فرقہ چاہتا ہے کہ میرے فرقے کے لوگ زیادہ ہوں۔ اور اس میں بھی فرسودگی کی حالت یہ ہے کہ اپنے دینی علوم سے سماجی مسائل کو حل کرنے کا کوئی سلیقہ اور ملکہ نہیں، اور وہ اصول اور معیار جس کی بنیاد پر سماجی مسائل کو حل کیا جاسکے، اُس کی تعلیم اور تربیت کا بندوبست نہیں ہے۔

جب یہ صورتِ حال ہمارے ملک میں ہے تو نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ مختلف قسم کے ذہن' سوسائٹی کے اندر اپنا خام مال خام تعلیم کے ذریعے سے پیدا کرتے ہیں۔ تعلیم نے افراد کے اندر کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی، لیکن کس کے لیے؟ قومی سوچ کیا ہے؟ نظریۂ تعلیم کیا ہے؟ اجتماعی نتائج کیا حاصل کرنے ہیں؟ اُس کا شعور نہیں ہے۔ اس لیے آج ہمارے پاکستان میں جتنے بھی تعلیمی ادارے ہیں، وہ ملازمت کے نقطہ نظر سے ہیں، قیادت کے نقطہ نظر سے نہیں ہیں۔ قومیں قیادت کے نقطہ نظر سے ترقی کرتی ہیں، لیکن اگر کسی تعلیم کا بنیادی مقصد صرف دوسروں کی ملازمت ہو، غلامی بجالانا ہو، وہ پنجابی میں کہتے ہیں کہ 'نوکر کی تے نخرہ کی'۔ نوکر نوکر ہوتا ہے، اس لیے یہ طبقہ دنیا بھر کے لیے بڑا اچھا خام مال ہے۔ ملٹی نیشنل ادارے کو ضرورت ہوتی ہے تو یہ کھپ جاتے ہیں، این جی اوز کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ کھپ جاتے ہیں۔ مڈل ایسٹ کو ضرورت ہوتی ہے تو وہاں ایڈجسٹ ہوجاتے ہیں۔ امریکا کو ضرورت ہوتی ہے تو وہاں ایڈجسٹ ہوجاتے ہیں۔ یورپ کو ضرورت ہوتی ہے تو وہاں ایڈجسٹ ہوجاتے ہیں۔ اور سوال یہ ہے کہ قوم کے لیے نتائج کیا ہیں؟ ایک امریکی دنیا میں جہاں بھی جائے گا، وہ اپنی قوم کا نمائندہ بن کر جائے گا۔ ایک جرمن جرمنی کا ہونے پر فخر کرتا ہے۔ ایک چائنیز اپنے چائنیز ہونے پر فخر کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے چائنیز ہونے پر کمپرومائز نہیں کرے گا۔ اپنے ملکی وقار پر کمپرومائز نہیں کرے گا۔ اپنے نظریے پر کمپرومائز نہیں کرے گا، لیکن پاکستان کا نظریہ کیا ہے؟ اس کا نصب العین کیا ہے؟ اُس نے قوم کی قیادت کے لیے کیا اقدامات کرنے ہیں؟ اپنے مسائل کیسے حل کرنے ہیں؟ جب نظامِ تعلیم ہی انتشار کا شکار ہے اور تقسیم وتفریق کا شکار ہے، فرقہ واریت اور پست ذہنیت پیدا کی جاتی ہے۔ ملازمت کی ذہنیت پیدا کی جارہی ہے تو انسانی

صلاحیتوں کا اُبھرنا، اُن کا ترقی کرنا، یقیناً سوسائٹی کے اندر ناپید نظر آتا ہے۔ اس لیے 72 سال میں ہم ملک میں کوئی قیادت نہیں پیدا کر سکے۔ 72 سال میں ہم وہ نتائج نہیں پیدا کر سکے، جو قوم آزادی کے بعد کوئی نتیجہ پیدا کرتی ہے۔

میرے محترم دوستو! ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) ان حالات میں کالج اور یونیورسٹی کے گریجویٹس اور مدارس کے فضلاء کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ ان سب کو مشترکہ طور پر دعوت دیتا ہے کہ آئیں، ہم مکالمہ کریں۔ گفت و شنید کریں۔ سوالات قائم کریں۔ جوابات پر غور کریں۔ ہمارا جو مین پوائنٹ ہو، وہ یہ کہ ہم اپنے سماجی، معاشی، سیاسی، اجتماعی، قومی مسائل کو کیسے حل کر سکیں؟ قرآن و سنت اس سلسلے میں ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھیں کہ اُس دور میں عرب کے قومی مسائل اور انسانیت کے مسائل آپؐ نے کیسے حل کیے ہیں؟ اُس کے لیے کیا اصول دیے ہیں؟ اور اُن اصولوں کو لے کر ہم آج کے دور میں اپنے مسائل کو کیسے حل کر سکتے ہیں؟

یہ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) ہمارے بزرگ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے 2001ء میں لاہور میں قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ ایک ٹرسٹ ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس ادارے کے مختلف کیمپسز پورے ملک بھر میں قائم ہیں۔ جیسا کہ یہ پروگرام ہمارے ریجنل کیمپس ملتان کے تعاون سے BZU میں منعقد ہو رہا ہے۔ کراچی میں، سکھر میں، ملتان میں، راولپنڈی میں، پشاور میں، کوئٹہ میں، صادق آباد میں اس کے ریجنل کیمپسز ہیں۔ ہم فاصلاتی نظامِ تعلیم کے طرز پر کام کر رہے ہیں اور مکالمے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس جو نوجوان آتے ہیں، ہم مکالمے کے ذریعے سے، تبادلہ خیال کے ذریعے سے آزاد ماحول میں گروپ بندی، فرقہ واریت، لسانی تعصّبات، علاقائی تعصّبات اور طبقاتی سوچ سے بالاتر ہو کر اپنے قومی اور اجتماعی مسائل پر غور و تدبر کرتے ہیں اور گفت و شنید کرتے ہیں۔

یہ ادارہ مروّجہ سیاست اور روایتی سیاسی عمل سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ اس خطے کے جو فریڈم فائٹرز گزرے ہیں، اور اس خطے کے جو حقیقی حریت پسند رہنما ہیں، ان سے رہنمائی لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے واسطے سے قرآن و سنت کا شعور پیدا کر کے ایک نوجوان میں یہ صلاحیت بیدار کرنا چاہتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے مسائل پر غور و تدبر کر کے اپنے مسائل کو حل کر سکیں۔ اس لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی جو موضوع ہم نے رکھا ہے، یہ موضوع پاکستانی معاشرے کا استحکام، اس میں مسائل کیا ہیں؟ اور اس استحکام کے قیام کے تقاضے کیا ہیں؟ اس پر ہم سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں غور و تدبر کریں گے۔ آپ احباب سے گزارش ہے کہ آپ دل جمعی کے ساتھ اس میں شریک ہوں اور اس میں یقیناً آپ دوستوں کی جو تجاویز ہوں گی، وہ بھی ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ اس لیے آپ سے آخر میں تجاویز بھی لی جائیں گی اور سوالات و جوابات کا موقع بھی دیا جائے گا۔ اس لیے جن احباب کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں، وہ اپنے پاس نوٹ کر لیں، تاکہ بہتر انداز میں ہم اس طرح کی نشستوں کو آگے بڑھا سکیں۔ بہت شکریہ!

پاکستانی معاشرے کا استحکام، مسائل و تقاضے اور اُسوۂ حسنہ

خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری
تاریخ: ۲۳ / ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ / 21 / نومبر 2019ء، بروز جمعرات
مقام: آئی ایم ایس ہال، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

خطبہ مسنونہ

نحمدهٗ و نصلّی علٰی رسولهِ الکریم، أمّا بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالٰی: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (2) و قال اللّٰہ تعالٰی: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (3) و قال النّبیّ ﷺ: کانت بنو اسرائیل تسوسهم الأنبیاء کلما هلک نبی خلفهٗ نبی آخر ألا لانبی بعدی سیکون خلفاء فیکثرون. (4) و قال النّبیّ ﷺ: لا تزال طائفة من اُمّتی قائمین علٰی الحقّ، لا یضرّهم من خالفهم. (5)

صدق اللّٰہ مولانا العظیم و صدق رسوله النّبیّ الکریم.

صاحبِ صدر اور عزیز طلبا و طالبات!

ہم یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں اپنے معاشرے سے متعلق اُمور پر تبادلۂ خیالات کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یقیناً ربیع الاوّل کے مہینے میں حضور اقدسؐ کی سیرتِ مقدسہ سے رہنمائی لینا' ہمارے ہاں ایک روایت بن چکا ہے۔ یوں تو ہمیں پورے سال اور پوری زندگی نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ سے رہنمائی لینے کی ضرورت ہے، لیکن ایک روایت اس ماہِ مبارک میں حضورؐ کی سیرت پر گفتگو کرنے سے متعلق رہی ہے۔ یہ ماہِ مبارک وہ ہے کہ جس میں نبی اکرمؐ دنیا میں تشریف لائے اور ٹھیک چالیس سال کی عمر مبارک میں نبی اکرمؐ پر سچے خواب — نبوت کی ابتدائی صورت میں ظاہر ہونا — شروع ہوئے۔ اسی ماہِ مبارک میں آپؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور اسی ماہِ مبارک میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ گویا کہ آپؐ کی زندگی کے اہم ترین نقطہ ہائے انقلابات (turning points) وہ ہیں، جن کا تعلق اس ماہِ مبارک سے ہے۔

سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ؛ آج کے اجتماعی دور کا بنیادی تقاضا ہے

عزیز طلبا و طالبات!

آج ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ حضور اقدسؐ کی زندگی کے، کسی مملکت کے استحکام سے متعلق، کسی معاشرے کو درست خطوط پر استوار

کرنے سے متعلق کون سے ایسے اُمور ہیں، جنھیں پیش نظر رکھ کر اپنے ملکی مسائل کو سمجھنے اور ان مسائل کے حل کرنے کے بنیادی تقاضے اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ آج اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ہم گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں اور زوال کی حالت میں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مسلمان ممالک اپنی سیاسی اور اجتماعی طاقت سے محروم ہیں۔ ایسے میں زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ سے رہنمائی لے کر اپنے اجتماعی مسائل حل کرنے کے لیے غور و فکر کریں اور آپؐ کی اجتماعی زندگی سے متعلق پہلوؤں پر توجہ دیں۔

ہمارے ہاں سیرتِ نبویؐ کے نام سے جو گفتگو کی جاتی ہے، اس کا بڑا تعلق حضورؐ کے انفرادی اوصاف و خصائص سے ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنے ذاتی اور شخصی تناظر میں کون سا لباس زیبِ تن فرمایا؟ کون سا کھانا پسند فرمایا؟ کون سی خوشبو پسند فرمائی؟ وغیرہ وغیرہ، لیکن اجتماعی نقطہ نظر سے انسانی سماج میں کیا تبدیلی پیدا کی؟ انسانی معاشروں کو کس تناظر میں سمجھا؟ سوسائٹی کے مسائل سمجھ کر انھیں حل کرنے کا طریقۂ کار کیا اختیار کیا؟ اس پر عام طور پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ جس ادارے کے ہال میں ہم یہاں موجود ہیں، اس کا بنیادی ہدف ہی مینجمنٹ ہے۔ مینجمنٹ کا بنیادی اساسی اُصول مسائل سمجھنا، اُن کا درست ادراک کرنا، اُن کی درجہ بندی کرنا اور پھر اُن سے نمٹنے کے لیے ایسی صحیح حکمتِ عملی اختیار کرنا، جس کے ذریعے سے درست طور پر مسائل حل ہوں۔ جن مقاصد کے لیے جس شعبے میں بھی ہم کام کر رہے ہیں، مثلاً تجارت ہے، زراعت ہے، انتظامی نظم و نسق ہے، اجتماعیت سے متعلق جتنے شعبہ ہائے زندگی ہیں، ہم انھیں حسن و خوبی کے ساتھ ایک معیار کے مطابق کرنے کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کریں۔ مینجمنٹ کے نقطہ نظر سے اگر حضور اقدسؐ کی سیرتِ مقدسہ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بہت فکر افروز ہے۔ وہ اجتماعی شعور کی بلندی کے لیے ایک واضح اور روشن راستہ ہمارے سامنے متعین کرتا ہے۔

حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر ایک اِجمالی نظر

عزیز طلبا و طالبات!

ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اقدسؐ کی ولادتِ مبارکہ 20/ اپریل 570ء ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی۔ نبی اکرمؐ ربیع الاوّل ہی کے مہینے میں 632ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس 63 سالہ حیاتِ مبارکہ میں آپؐ نے انسانی مسائل کو کس نظر سے دیکھا؟ اُن کی کیا درجہ بندی کی؟ اور اُن سے نمٹنے کے لیے آپؐ نے کیا حکمتِ عملی اختیار کی؟

ظالموں کے خلاف مظلوموں کی مدد کے معاہدے میں شرکت

سیرت کی کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ 16 سال کی عمر میں، جب آپؐ نے شعور کی آنکھ کھولی۔ ایک نوجوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے گرد و پیش، اپنے ملک اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو آپؐ نے ایک ایسے اجتماع میں شرکت کی، جس کے نتیجے میں ایک معاہدہ وجود میں آیا، جسے حِلف الفُضُول کہا گیا ہے۔ گویا کہ نوجوان محمدؐ نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مکہ میں جو ظلم کا نظام موجود تھا، مکہ کے سردار باہر سے آنے والے تاجروں کو لوٹتے تھے، لوگوں کو غلام بنا کر اُن سے بیگار لیتے تھے۔

دیگر قوموں اور نسلوں کو حقیر سمجھ کر اُن سے پستی اور ذلت کا سلوک کرتے تھے۔ اس پورے ماحول میں نبی اکرمؐ نے جو مشاہدہ کیا، وہ یہ کہ اس معاشرے میں ایک ایسا طبقاتی نظام قائم ہے کہ ایک طرف ظالم ہے اور ایک طرف مظلوم ہیں۔ گو مکہ کے معاشرے میں بڑی خرابیاں تھیں، بہت سے مسائل تھے، بہت سی مشکلات تھیں، لیکن درجہ بندی میں جو سب سے اوپر مسئلہ قرار پاتا ہے اس اجتماع میں، وہ ظلم ہے۔

حِلفُ الفُضُول کا معاہدہ اگر ہم پڑھیں تو اس میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ اس اجتماع کے تمام لوگ اس بات پر حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم سب مل کر ایک متحدہ طاقت اور قوت ہیں۔ اللہ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں:

''بِاللّٰہ! لنکوننّ یداً واحداً مع المظلوم علیٰ الظّالم.'' (6)

(اللہ کی قسم! ظالموں کے خلاف، مظلوموں کی مدد کے لیے ہم ایک متحدہ ہاتھ اور قوت ہیں۔)

اللہ کی قسم ہم سب ایک مٹھ ہیں، ایک ہاتھ ہیں، ایک مُکا ہیں، ایک اجتماعیت کی صورت ہیں۔ اس اجتماعیت کا مقصد ظالم کے خلاف اقدامات کرنا ہے اور مظلوم کی مدد کرنا ہے۔ مظلوموں کی مدد کے لیے یہ اجتماع حلف اُٹھاتا ہے اور ظالم کے خلاف اقدامات تجویز کرتا ہے۔ اس جرگے یا اجتماع کے سربراہ حضرت زبیر بن عبدالمطلب ہیں، جو بنو ہاشم کے سردار ہیں۔ حضورؐ اُن کے ساتھ ہیں۔ آپؐ ہی کی مشاورت اور آپؐ ہی کی تحریک معلوم ہوتی ہے کہ زبیر اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ اور یہ معاہدہ وجود پذیر ہوتا ہے کہ ہم ظلم کے خلاف متحدہ طاقت بن کر اقدامات کریں گے۔

یہ موقع اُس وقت ہے، جب ایک یمنی تاجر کو ایک سردار لوٹ لیتا ہے اور وہ جبل ابی قبیس پر کھڑے ہو کر مکہ کے ظالم تاجروں کے بارے میں نشان دہی کرتا ہے کہ انھوں نے میرا مال لوٹ لیا۔ مجھے پیسے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ گویا کہ گردوپیش میں بے شمار مسائل میں سے نوجوان حضرت محمدؐ — 16 سال کی عمر میں — جب آپؐ ابھی شعور کی آنکھ کھولتے ہیں، گردوپیش کے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو جو سب سے بڑا مسئلہ آپؐ کے سامنے آتا ہے، وہ ظلم اور اس کا خاتمہ ہے۔ ظلم کی نشان دہی کی ہے کہ ایک طبقہ ظالم ہے اور ایک طبقہ مظلوم ہے۔ مظلوموں کی ہمیں مدد کرنی ہے ظالموں کے خلاف۔ اب جب یہ بات معاہدے کے طور پر طے ہو جاتی ہے تو نبوت سے پہلے آپؐ کی اگلی چوبیس سالہ زندگی وہ ہے کہ جس میں آپؐ نے اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے تمام تر اقدامات کیے جائیں۔ حضورؐ کی سیرت سے متعلق جو بنیادی پوائنٹس محفوظ ہیں، ان میں ایک حِلفُ الفُضول کا معاہدہ ہے۔

پھر یہی نہیں، روایات میں آتا ہے کہ اس معاہدۂ حِلفُ الفُضول کے بعد ابوجہل حضورؐ سے چھپتا پھرتا تھا۔ حضورؐ کو کسی مظلوم کے بارے میں پتہ چلتا کہ کسی سردار نے اس کا حق غصب کر لیا تو آپؐ اُس کا ہاتھ پکڑتے، ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹاتے، گلی بازار میں مل جاتا تو وہاں اُسے پکڑ کر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ اس پر فلاں سردار نے ظلم کیا ہے، اس کا حق دلواؤ۔ تم جو یہاں کے حکمران اور سربراہ ہو، تمھاری ذمہ داری ہے کہ ان مظلوموں کی مدد کرو۔ معاہدے پر تمام لوگوں کے دستخط ہیں، حِلف الفضول کے معاہدے کے تحت ان سے ظلم کا ختم کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

صادق اور امین کی حیثیت سے آپؐ کی شناخت

اگلے چوبیس سال آپؐ کی پوری زندگی ظلم کے خاتمے، اور ظالم کی مزاحمت کرنے میں گزرتی ہے۔ ظالم کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ سردار خوف زدہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے جو معاہدہ کیا، اس پر پورے صدقِ دل سے جب عمل کیا تو آپؐ کو ''صادق'' اور ''امین'' کہا گیا۔ صداقت کا لقب اس معاہدے پر مِن وعَن عمل کرنے کی وجہ سے آپؐ کو ملا۔ لوگوں کی امانتیں اُن کے گھر تک پہنچانے، اُن کے راز کی حفاظت کرنے، مظلوموں کی مدد کرنے، پوری دیانت داری کے ساتھ اُمور سرانجام دینے کی وجہ سے ''امین'' کا لقب ملا۔ اجتماعی مسائل کے حل کے لیے یہی صداقت اور امانت ہے، جو نبی اکرمؐ کی شناخت بن کر اُبھری۔

لوگوں کی شراکت سے اجتماعی کردار کا عملی نمونہ

پھر اس پورے عمل میں آپؐ کی تمام ذمہ داریاں اجتماعیت کی صورت لیے ہوئے ہیں۔ ہر معاملے میں معاشرے کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ مکہ والوں نے رزقِ حلال کا بندوبست کیا ہے۔ اس سے عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ حجر اسود نصب کرنے کا موقع آتا ہے تو اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ کون آدمی یہ اعزاز حاصل کرے کہ حجر اسود اپنے اصل مقام پر نصب کر دیا جائے۔ کافی اختلاف کے بعد یہ طے ہوا کہ جو صبح کو سب سے پہلے آئے گا، وہ نصب کرے گا۔ جھگڑا نمٹانے کا ایک طریقہ طے کر دیا۔ صبح نبی اکرمؐ سب سے پہلے حرم میں تشریف لائے۔ اُصول اور قانون اور معاہدے کے مطابق آپؐ اکیلے اس بات کے حق دار تھے کہ حجر اسود اُٹھا کر اپنے اصل مقام پر رکھ دیں۔ لیکن آپؐ نے مسائل کے حل کا جو طریقۂ کار اپنایا، وہ اجتماعی تھا۔ اپنی چادر مبارک بچھائی۔ حجر اسود اُٹھا کر اُس میں رکھا اور ہر قبیلے کا سردار طلب کیا اور اُن سب سے کہا کہ چادر اٹھانے میں تمام شریک ہو جائیں۔ اجتماعیت کو برقرار رکھا۔ جو مسئلہ پیدا ہو چکا تھا، جس میں ہر آدمی کے دل میں یہ کسک رہتی کہ ہم اس اعزاز سے محروم رہ گئے، لیکن آپؐ نے سب کو اس اجتماعی عمل میں شریک کر لیا۔ وہ سب لوگ چادر اُٹھا کر حجرِ اسود نصب کرنے کی جگہ پر قریب لے آئے تو آپؐ نے اسے اُٹھا کر مقررہ مقام پر نصب کر دیا۔ آپ دیکھئے کہ مسائل کو سمجھنا اور مسائل کو حل کرنے کی اجتماعی حکمتِ عملی اپنانا یہ نبی اکرمؐ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، جو قبل از نبوت بھی اپنی صداقت اور امانت کی صورت میں واضح ہو چکی ہے۔

آپؐ کے اجتماعی کردار کے اظہار کا ایک اہم ترین موقع

دوسرا اہم ترین موقع وہ ہے کہ جب آپؐ پر وحی آتی ہے اور وحی کے بعد حضورؐ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہنچتے ہیں اور اور اُن سے جو تجربہ ہوا ہے، اُسے بیان کرتے ہیں۔ فرشتے کے بھینچنے اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ [7] پڑھانے سے متعلق واقعات انھیں بتاتے ہیں۔ ایسے موقع پر گھبراہٹ اور بے چینی آپؐ پر طاری ہوئی۔ اس کا اظہار حضرت خدیجہؓ کے سامنے حضورؐ نے کیا: خشیت علیٰ نفسی (مجھے اپنی جان کا ڈر ہے) تو حضرت خدیجہؓ نے جو بات آپؐ کی سیرت سے متعلق ہمیں بتلائی، وہ یہ کہ ''**لا یُخزیک اللّٰہ ابداً**'' [8] کبھی بھی اللہ آپ کو رُسوا نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ مسافروں کی خدمت کرتے ہیں۔ ''**تکسب المعدوم**'' جو لوگ کما نہیں سکتے، آپؐ انھیں کما کر کھلاتے ہیں۔

''**تحمل الکلّ**''، جو مزدور بوجھ نہیں اٹھا سکتا، آپؐ ان کا بوجھ اٹھا کر ان کی منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ نیز آپؐ کے بارے میں حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں کہ ''**و تُعین علیٰ نوائب الحقّ**'' انسان کسی قدرتی آفت یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں تو آپؐ ان کے مددگار بنتے ہیں۔ ان پانچوں اُمور کا تعلق انسانی سماج کے اُن مسائل سے ہے، جو مظلوموں سے متعلق ہیں۔ ایک مسافر جس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا، اُس کے حقوق کا تحفظ کرنا، ایک ایسا آدمی جو کما نہیں سکتا، اُسے کما کر کھلانا، ایک وہ کمزور جو بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اس کا بوجھ اٹھانا۔ یہ مظلوموں کی مدد ہے۔

وحیِ الٰہی کی روشنی میں ظلم کے خلاف مزاحمتی فکر و عمل کا اعلان

پھر یہی نہیں، بلکہ جب نبوت آپؐ کو ملتی ہے تو اُس میں بھی جو بنیادی حکم دیا گیا، وہ یہ کہ ظلم کے اس نظام کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ سورت العلق سب سے پہلی سورت ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیات میں اللہ کا نام پڑھنے، اس کے ساتھ وابستہ ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان پانچ آیات میں بھی تعلیم کی اہمیت واضح کی گئی ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ [9] انسان جسے نہیں جانتا، اللہ نے وہ تعلیم دی ہے۔ تو تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ تعلیم کے اہداف کیا ہیں؟ تعلیم کے نتائج کیا ظاہر ہونے چاہئیں؟ انبیا کی تعلیم بالخصوص کن مقاصد و اہداف کے لیے آتی ہے؟

آپ چوں کہ اس درس گاہ کے طلبا ہیں، علم حاصل کر رہے ہیں۔ یوں تو ہر آدمی کو اپنی ہوش سنبھالنے سے لے کر موت تک علم کا طالب رہنا چاہیے، لیکن ایک طالبِ علم کو اپنی رسمی طالب علمی کے زمانے میں علم کی طلب ہونی چاہیے اور علم کے پیچھے جو مقصد کارفرما ہے، جو نظریہ ہے، وہ واضح رہنا چاہیے کہ آپ کس مقصد کے لیے تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ کیا صرف ملازمت؟ کیا صرف کوئی دُنیوی راحت؟ یا کیا صرف اپنے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے؟ یا اجتماعی مقاصد کے لیے علم حاصل کیا جائے؟

قرآنی تعلیم کے تین مقاصد و اہداف

قرآن حکیم کہتا ہے کہ تعلیم کے مقاصد و اہداف یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی سوسائٹی میں ظلم کی پہچان پیدا کرے اور پھر وہ ہر طرح ظلم کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ اپنی آزادی اور حریت کو اپنے لیے، اپنے اجتماع کے لیے محفوظ بنانے کی جدوجہد اور کوشش کرنا، یہ تعلیم کا بنیادی ہدف ہے۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ [10] جو انسان نہیں جانتا تھا، اللہ نے وہ تعلیم دی۔ اُس تعلیم کا آغاز ہی کہاں سے ہوتا ہے؟ ان آیات میں درجِ ذیل نکات بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں:

1۔ کسی انسان کی سرکشی اور ظلم قابلِ قبول نہیں

ارشادِ خداوندی ہے: کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی [11] خبردار! ہرگز ہرگز یہ بات قابل قبول نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر سرکشی کرے، ظلم کرے، زیادتی کرے۔ لَیَطْغٰٓی کی تفسیر خود قرآن حکیم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بیان کردی کہ فرعون کی سرکشی اور طغیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن حکیم کہتا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ

(فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں، اور کر رہا تھا وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے، کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو، اُن میں ذبح

کرتا تھا ان کے بیٹوں کو، اور زندہ رکھتا تھا اُن کی عورتوں کو۔ بے شک وہ تھا خرابی ڈالنے والا۔)(12)

''علو فی الارض'' قرآن کی ایک اصطلاح ہے، بالادستی اور آمریت پر مبنی ایسا نظام، جس کے ذریعے سے دوسرے انسانوں، قوموں اور نسلوں کو غلام بنا کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اُن کے لڑکوں اور مردوں کو قتل کیا جائے اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ طبقاتی تقسیم پیدا کر دی جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ بڑا فسادی تھا۔ ارشادِ خداوندی ہے: يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (13) فساد کی دوسری جگہ پر تعریف کی کہ فسادی وہ ہے کہ جو

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (14)

(اور جب پھرے تیرے پاس سے دوڑتا پھرے ملک میں، تا کہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کریں کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو)

فسادی وہ ہے، جو معاشی وسائل کو آگ لگاتا ہے، نسلوں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فسادی کو پسند نہیں کرتا۔ اسی فساد کو ''طاغوت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (15) (جاؤ فرعون کی طرف کہ اُس نے سرکشی کی ہے)۔

یہاں سورت العلق کی اس آیتِ مبارکہ میں واضح طور پر کہا گیا کہ یہ بات کسی طور پر بھی قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی انسان کسی دوسری قوم، نسل، فرد کو غلام بنا کر اُس کا استحصال کرے، اُس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے، استحصال کرے، اس پر ظلم اور زیادتی کرے، یہ ظلم قابل قبول نہیں۔

علم شعور دیتا ہے۔ حریتِ فکر عطا کرتا ہے۔ آزادی سے سوچنے کا موقع دیتا ہے۔ حقائق کا ادراک کرنے اور مسائل کی نشان دہی کا طریقہ سکھاتا ہے۔ جو علم سوچنے سمجھنے کی تخلیقی صلاحیت طالبِ علم میں منتقل نہیں کرتا، وہ علم نہیں ہے۔ علم محض رٹنے کا نام نہیں ہے۔ علم محض نقل یا تبلیغ کا نام نہیں ہے۔ علم کے ذریعے سے اساتذہ اپنے طلبا میں وہ مہارت منتقل کرتے ہیں، جس سے اُن میں تخلیقی اُبھار پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ملک اور قوم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کردار ادا کر سکیں۔ یہ تبھی ہوگا کہ جب اُن کے ذہنوں پر کوئی بھی مسلط کردہ ظلم یا جبر نہ ہو۔ نہ سرمائے کا جبر ہو، نہ جاگیر کا جبر ہو، نہ مذہبی پاپائیت کا جبر ہو۔ نہ کوئی ظلم و زیادتی کا عمل ہو۔ علم اُس کے فکر کو بلند کرے۔ اس میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرے، تقلیدی نہیں۔ تقلیدی صلاحیت تو طوطا بھی سیکھ لیتا ہے، وہ بھی ''میاں مٹھو چوری کھائی ہے'' کہتا ہے۔ وہ بھی ذکر کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ تقلیدی علم ہے۔ اللہ نے انسان ایک ایسی مخلوق بنائی ہے، جس کے بارے میں اس نے کہا: ہم نے اس کو ''احسنِ تقویم'' بنایا ہے، اس کے اندر تخلیقی کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان جانوروں سے جن بہت سی خصوصیات سے ممتاز ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان میں ایجاد و تقلید کا مادہ ہے۔ پہلے جو علوم ہیں، ان کو سمجھنا اور نئی چیزیں ایجاد اور تخلیق کرنا۔ یہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

2۔ظلم کے خلاف عملی مزاحمت بھی ضروری ہے

قرآن نے پہلی بات جو واضح کی، وہ یہ ہے کہ کسی طرح کے ظلم کو انسانی معاشرے میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف فکر اور نظریہ ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب ایک طالب علم میدانِ عمل میں جاتا ہے تو اسے عملی کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔ جو علم ہم حاصل کرلیں اور پریکٹیکل اس کا کچھ نہ ہو۔ باہر جا کر عملی طور پر وہ کام نہ کرسکیں تو یہ بھی درست نہیں۔ اس تعلیم کے نتیجے میں عملی طور پر ہمیں کیا کام کرنے ہیں؟ اُس کے بارے میں بھی قرآن کی اسی سورت میں یہ دوسرا نکتہ بیان کیا گیا کہ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ [16] اگر یہ ظالم ظلم سے باز نہیں آتا، جو کہ ابوجہل ہے، ظالم لوگ ظلم سے باز نہیں آتے تو پھر کیا ہونا چاہیے؟ اب حریتِ فکر کے ساتھ طلبا کی پوری اجتماعیت تعلیم حاصل کرکے باہر معاشرے میں جائے اور وہاں ظلم کا ماحول موجود ہو اور وہ ظلم کی مزاحمت کے لیے عملی طور پر کوئی جدوجہد نہ کرے تو ایسی تعلیم کس کام کی؟

قرآن نے کہا: لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ اگر یہ ظلم سے باز نہیں آتا تو لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ تو ہم اس کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹ لیں گے، تاکہ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان میں عملی طور پر اُبھار پیدا ہو کہ ہماری اجتماعیت، ہماری متحدہ طاقت، ہمارے نوجوانوں کی قوت اُس ظالم کو اُس کی پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹ لے گی۔ قرآن حکیم صحابہؓ سے کہہ رہا ہے کہ مت ڈرو، حضرت بلال حبشیؓ سے کہا جا رہا ہے، حضرت صہیب رومیؓ سے کہا جا رہا ہے، حضرت یاسرؓ اور حضرت عمارؓ سے کہا جا رہا ہے، مظلوم اور کمزور انسانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اٹھو اور اپنے سردار کی پیشانی پر ہاتھ ڈالو۔ مت گھبراؤ کہ سردار کی پیشانی ہے، ظالم کی پیشانی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ [17] اس کی پیشانی جھوٹی ہے، خاطی اور مجرم ہے، یعنی انسانیت کے خلاف جرائم کرنے والی ہے۔

اس آیت میں اُس بداَخلاق اور ظالم کے دو وصف بیان کیے کہ وہ جھوٹا بھی ہے کہ حِلفُ الفُضول کے معاہدے پر آئین اور قانون اور دستور جو میثاقِ مکہ ہے، اس کو مانتا بھی ہے، اس معاہدے پر دستخط بھی کرتا ہے، لیکن عمل درآمد نہیں کرتا، جھوٹا ہے۔ حضورؐ اس معاہدے کی پاسداری کرتے ہیں تو ''صادق'' اور ''امین'' ہیں۔ اور ابوجہل اور اُس کے حواریّین اس پر عمل نہیں کرتے تو قرآن کہتا ہے کہ ''كَاذِبَةٍ'' (جھوٹی جماعت) ''خَاطِئَةٍ'' (بددیانت اور مجرم جماعت)، ان کی پیشانیاں جھوٹی ہیں، یہ خطاکار ہیں۔ یہ مجرم ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ یہ ظالم اپنے دارالندوہ کے جو شریک ممبران ہیں، اُن کو بلائے گا۔ تو اس کو کہہ دو کہ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ [18] ''نادی'' مجلس کو کہتے ہیں، دارالندوہ جو مکہ میں سرداروں کا فورم بنا ہوا تھا، اس کو کہہ دو کہ اپنے پارلیمنٹ کے ممبران کو بلا لے۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ [19] ہم بھی اس کے مقابلے میں اپنی ''زبانیہ'' اُتاریں گے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ''الزَّبَانِيَةَ'' کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ہم بھی اپنے ''سیاسی پیادے'' ان کے مقابلے کے لیے میدان میں اُتاریں گے۔ چناں چہ ''زبانیہ'' اور ''نادیہ'' کا مقابلہ ہوگا، دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوگا، خواہ مزاحمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

3۔کسی صورت ظلم کے نظام کی اطاعت نہیں ہے، بلکہ اللہ کا قرب ضروری ہے

تیسری ایک اَور بات بیان کی ہے کہ جب آپ نے اپنے علم و شعور، اپنی حریتِ فکر سے ایک مسئلے کا تعین کرلیا کہ یہ ظلم ہے اور ظالم کے خلاف مزاحمتی جدوجہد شروع کردی تو اب ''كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ'' [20] اب کسی صورت ظالم کی اطاعت نہیں کرنی۔ اس کی

بات نہیں ماننی، بلکہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے۔ اللہ پر اعتماد رکھنا ہے، جو احکم الحاکمین ہیں۔ اس پر ایسا تعلق اور اعتماد ہو، جس سے آپ کے حوصلے ہمیشہ بلند ہوں۔

قرآنی تعلیم کے نتائج؛ مذکورہ بالا مقاصد کا حصول

آپ دیکھیے کہ یہ تین نکاتی ایجنڈا، جو علم کے نتائج کی صورت میں کسی علم وشعور پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن حکیم کی پہلی ہی سورتِ مبارکہ میں یہ واضح کر دیا۔ اور نبی اکرمؐ کی پوری سیرتِ مقدسہ اسی کی عکاس ہے کہ آپؐ نے مکہ مکرمہ میں جس نوجوان کو بھی تعلیم دی، اور اُس نے وہ علم سیکھا، مسلمان ہوتا تھا تو سب سے پہلے وہ قرآن سیکھتا تھا۔ اور سب سے پہلے یہ سورت سیکھتا تھا۔ سورت العلق پڑھتا تھا۔ عربی زبان اُس کی اپنی زبان تھی۔ قرآن کی زبان جب اُن کے سینوں میں اُترتی تو وہ حریتِ فکر بلند کرتی۔ اندازہ لگایئے کہ اُس بلال حبشیؓ نے، جو جاہل بھی ہے اور معاشی طور پر پست بھی ہے، غلام بھی ہے، کالا کلوٹا بھی ہے، قریشیوں کے ہاں اُس کی کوئی عزت نہیں ہے۔ جب اُس نے یہ کلمہ پڑھا اور یہ سورت پڑھی تو وہی بلالؓ ہے کہ جس کی حریتِ فکر کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ابوجہل تپتی ہوئی ریت پر ڈال کر اُن کی آزادانہ رائے سے انھیں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم نے ہماری اجازت کے بغیر یہ بات کیوں مان لی؟ ہم سے اجازت تو لیتے۔ جیسے فرعون نے اُن جادوگروں سے کہا تھا کہ میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ پر ایمان لانے کا فیصلہ کرلیا؟ تم تو میرے غلام ہو۔ میرے تابع ہو۔ تمھیں تو خود سوچنے کا اور فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن آپ دیکھیے کہ بلالؓ میں حریتِ فکر پیدا ہوئی۔ صہیب رومیؓ ہیں، یاسرؓ ہیں، عمارؓ ہیں، مظلومین اور کمزور لوگوں میں حریتِ فکر پیدا کر دیا۔ اور وہ مزاحمت کی علامت بن گئے۔

سیرتِ نبویؐ کا ایک بڑا اِمتحان

یہاں تک کہ مکہ کے سردار حضورؐ کو دعوت دیتے ہیں، جب انھوں نے تحریک کو بڑھتے ہوئے دیکھا، اس تعلیم وتربیت اور اس نظریے اور شعور کے ساتھ تربیت کے مرحلے کو آگے بڑھتے دیکھا تو انھوں نے اگلی پلاننگ کی۔ ہمیشہ ظالم اور سرمایہ دار جب دیکھتا ہے کہ عوامی طاقت اُٹھ رہی ہے تو پھر لیڈر شپ کو خریدنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ آپؐ مکہ کے سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو سردار ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کو سرمایہ اور دولت چاہیے تو سونے کا ڈھیر لگانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ مکہ کی کسی خوب صورت خاتون سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ کرانے کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سے بتایئے کون سی چیز چاہیے؟ آپ ہمارے ساتھ شراکتِ اقتدار کرلیں۔ اس کے اندر رہ کر جو تبدیلی لانا چاہتے ہیں، وہ لے آئیں۔ اس سسٹم کے اندر رہتے ہوئے اسی پارلیمنٹ کے ممبر بن جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ:

> ''خدا کی قسم! اگر ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ آپ ہماری پیش کش قبول کرلو تو ایسا نہیں ہوسکتا''۔ (21)

اللہ نے جو مجھے حق پیغام دیا ہے، میرے علم وشعور اور میرے نبوت کے تقاضے سے جو بات مجھے یقینی طور پر معلوم ہوچکی ہے، اس کے مطابق مجھے پورا سسٹم بدلنا ہے۔ یہ ادھوری باتیں اور شراکتِ اقتدار کے پہلوؤں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

ہجرتِ نبویؐ اور ظلم کے خلاف غزوات کی صورت میں عملی مزاحمت

آپؐ تیرہ سال تک مسلسل صحابہؓ کی یہ تربیت یافتہ جماعت تیار کرتے ہیں۔ مدینہ کے پچاسی چھیاسی نوجوان حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ وہ اس نظریے کی تعلیم وتربیت حاصل کرتے ہیں۔ وہ آپؐ کو یثرب آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپؐ ان سے ایک معاہدہ کرکے مکہ سے منتقل ہوکر یثرب پہنچتے ہیں، جو بعد میں ''مدینةُ النّبی'' قرار پایا۔

مدینہ منورہ میں آپؐ مہاجرین وانصار کی اس اجتماعی طاقت کو اکٹھا کرکے بدر کے مقام پر لے آتے ہیں۔ جب اللہ نے حکم دے دیا اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا[22] تو آپؐ جنگ کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اب مظلوموں کی طرف سے لڑائی لڑنے کا وقت آ گیا ہے۔

جہاد وقتال کی علت اور سبب ظلم ہے

یادرکھیے! جہاد اور قتال کا بنیادی سبب اور علت ظلم ہے، کفر نہیں۔ ہر کافر سے لڑائی نہیں۔ ہر ظالم سے لڑائی ہے۔ یہ پچھلے چالیس پچاس سال میں یہاں کے مذہبی طبقے نے، یہاں کی اسٹیبلشمنٹ نے، یہاں کے مقتدر طبقوں نے جو ہمارے دماغوں میں ڈال دیا کہ دنیا کے ہر کافر سے مسلمان لڑتا ہے، یہ غلط ہے۔ قتال کی علت بیان کرتے ہوئے ارشادِ خداوندی ہے: ''بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' کہ وہ مظلوم ہیں۔ مظلوموں کو قتال کرنے کی اجازت ہے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر مقابلے اور مزاحمت کا پورا عمل نبی اکرمؐ اختیار کرتے ہیں۔ تاریخ نے دیکھا کہ بدر کے میدان میں ظالم ستر بڑے بڑے سردار راستے سے ہٹا دیے گئے۔ ان کی سیاسی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔ ستر بڑے بڑے سردار گرفتار کر لیے گئے۔ ظالموں کے خلاف مزاحمت کا جو معاہدۂ حِلفُ الفُضول حضورؐ نے کیا تھا، اس کی تکمیل آپ دیکھئے مدینہ منورہ پہنچ کر بدر کے معرکے میں ہوجاتی ہے۔ آپؐ ظالموں کا خاتمہ کرتے ہیں۔ مکہ کی ظالمانہ ریاست کی سیاسی طاقت توڑ دیتے ہیں۔

ریاستِ مدینہ کی تشکیل کا بنیادی میثاق؛ اجتماعیتِ انسانیت کا شاہکار

پھر مدینہ پہنچ کر آپؐ کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا ایک نیا تاریخی معاہدہ کرتے ہیں، جسے ''میثاقِ مدینہ'' کہا جاتا ہے۔ ''میثاقِ مدینہ'' ریاستِ مدینہ کی تشکیل کا بنیادی معاہدہ ہے۔ چناں چہ نبی اکرمؐ 52 دفعات پر مشتمل اُس جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام اقوام اور قبائل سے ایک متفقہ اور اجتماعی معاہدہ کرتے ہیں۔

اب آپ دیکھئے! یہاں بھی آپؐ کی بہترین مینجمنٹ، آپؐ کا سیاسی شعور، آپؐ کی مسائل پر گہری گرفت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یثرب کی آبادی میں ساڑھے نو ہزار مشرک یہودی اور غیرمسلم اور صرف پانچ سو مسلمان ہیں مرد اور عورت سب ملا کر۔ آپ دیکھئے کہ ایسی دس ہزار کی آبادی میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ایسی سیاسی مینجمنٹ آپؐ اختیار کرتے ہیں کہ سربراہ حضورؐ ہیں اور ریاست میں اس بات کا عہد کیا جاتا ہے کہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام لوگ اس ریاست کے یکساں شہری ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ ہوگا۔ حتیٰ کہ یہودیوں سے جو معاہدہ کرتے ہیں، اس میں تحریر ہے اس میثاقِ مدینہ میں کہ: ''أنّ یھود بنی عوف اُمّة مع المؤمنین''[23] (بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں)۔

ایک اُمت ہیں۔ ایک اجتماع ہے۔ گویا کہ سیاسی اور معاشی اجتماع میں انسانی بنیادوں پر معاملات طے پائیں گے۔ عقیدے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ عقیدہ کسی کا کچھ بھی ہے، لیکن انسان ہے، تو انسانی نقطہ نظر سے ان کے درمیان تمام معاملات عدل و انصاف پر مبنی ہوں گے۔ اس معاہدے میں نہ صرف یہودِ بنی عوف سے، بلکہ اُن کے ذیلی کوئی بارہ تیرہ کے قریب یہودی قبائل ہیں، جن سے الگ الگ انھیں شرائط کے ساتھ معاہدہ ہوا کہ وہ اُمّۃ مع المؤمنین ہیں۔

گویا کہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب ایسا عادلانہ آئین اور قانون آپؐ تشکیل دیتے ہیں، جو تمام انسانوں کے مسائل انسانی بنیادوں پر حل کرتا ہے۔ تہذیب، ثقافت، رنگ ونسل، مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس سے بالاتر نہیں۔ حتیٰ کہ یہودی اگر مسلمان کے خلاف مقدمہ لے کر آتا ہے اور یہودی سچا ہے تو حضورؐ یہودی کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں مسلمان منافق کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے۔ کئی واقعات ہیں، سورت النساء کا ایک پورا رکوع اسی موقع پر نازل ہوا۔ (24)

چوری پر ہاتھ کاٹنے کا قانون بھی اسی تناظر میں آیا کہ جب یہودی کے خلاف ایک مسلمان مقدمہ لے کر آیا، چوری کا جھوٹا الزام اُس پر لگا، یہودی کو بری الذمہ قرار دیا گیا، مسلمان منافق کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا۔ تو وہ منافق مدینہ چھوڑ کر مکہ پہنچ گیا۔ دشمن کے ساتھ مل گیا۔ کفر اختیار کرلیا۔ مرتد ہوگیا۔ آپ دیکھئے! یہ عدل وانصاف ہے۔ یہ عدل وانصاف کا آئین اور قانون بنایا۔

قومی آزادی اور حریتِ فکر کے بعد عدل وانصاف کا بنیادی اَساسی اُصول

قومی آزادی اور حریتِ فکر کے بعد دوسرا بڑا بنیادی مسئلہ جو حضور ﷺ نے حل کیا، وہ یہ کہ ریاست کی تشکیل میں مذہب، نسل، عقیدہ، زبان، تہذیب وثقافت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ انسانی حوالے سے عدل کے ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانیت کا منشور کوئی اَور ہوسکتا ہے؟ آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں۔ اور رحمت تبھی ہوں گے کہ جو آئین و دستور بنائیں، جو ضابطہ اور حلف اور میثاق کریں، وہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب ہو۔

مدینہ منورہ کی تمام آبادی پر مشتمل حضورؐ نے جو حکومت قائم کی، سیاسی طاقت پیدا کی، اس سیاسی طاقت سے امن وامان کو یقینی بنایا۔ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب ہر ایک کو جان، مال، عزت آبرو کا تحفظ دیا۔ ہر یہودی کو بھی تحفظ ہے۔ ہر مشرک کو تحفظ ہے۔ ہر مسلمان کو تحفظ ہے۔ اوس اور خزرج کو بھی، بنوقریظہ کو بھی، بنونضیر کو بھی، غرض! ہر طبقے کو امن وامان دیا۔

حکومتوں کا بنیادی کام امن وامان قائم کرنا ہے۔ آج ہم پولیٹیکل سائنس کی بنیادی فلاسفی یہی پڑھتے ہیں کہ اپنے جیسے انسانوں کی انسان حکومت اس لیے قبول کرتا ہے کہ اپنی داخلی سیکیورٹی فورسز — جنھیں آج پولیس کہا جاتا ہے — اور اپنی دفاعی سیکیورٹی فورسز — جنھیں فوج کہا جاتا ہے — کی طاقت کے بل بوتے پر ایسی اتھارٹی قائم کی جائے کہ ہر انسان جو اُس جغرافیائی حدود میں بس رہا ہے، اُس کو امن وامان، جان و مال، عزت وآبرو کا تحفظ حاصل ہو۔ اگر کوئی حکومت انسانوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہے، اُسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

نبی اکرمؐ نے ان مسائل کو سمجھا اور ان مسائل کے حل کرنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کی۔ پھر یثرب جو ایک چھوٹا سا قصبہ، بیماریوں کی آماج گاہ، زرعی طور پر پس ماندہ، معاشی طور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، آپؐ اس کو ریاستِ مدینہ کی صورت میں

اس کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے اُس کی زراعت کو ترقی دی، اس کی صنعت کو ترقی دی، اس کی تجارت کو ترقی دی اور اس کو ایک ایسا مرکزی شہر بنا دیا، جو تمدن اور تہذیب کا گہوارہ بنا۔ مدینہ کو ''مدینہ'' اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تمدن اور مدنیت سے عبارت ہے۔ سویلائزیشن، نئی تہذیب، نئی سوسائٹی کی تشکیل نبی اکرمؐ نے کی۔ اس علاقے کے مسائل دیکھے اور ان مسائل کے حل کرنے کی درست مینجمنٹ نبی اکرمؐ نے کی۔

حجۃ الوداع میں انسانی ترقی کے اُصولوں کا بیان

تقریباً نو دس سال مدینہ منورہ کی ریاست کا نظم قائم کر کے پھر حجۃ الوداع کے موقع پر کل انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دیا:

''إنّ دمائكم و أموالكم، و أعراضكم حرام عليكم كحرمة يومكم هٰذا، في بلدكم هٰذا، في شهركم هٰذا''. [25]

(بے شک تم انسانوں کا خون محترم ہے اور انسانوں کی محنت و مشقت سے کمایا ہوا مال اور تمھاری عزتیں بھی ایسے ہی محترم ہیں، جیسے یہ دن محترم ہے، یہ شہر محترم ہے، جیسے یہ مہینہ محترم ہے۔)

تم حرم کا احترام کرتے ہو اور انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہو؟ تم حرم کی مسجدوں کا احترام تو کرتے ہو، مگر لوگوں کی خون پسینے کی کمائی، اُن کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالتے ہو، کتنا بڑا جرم ہے۔

آپ ﷺ کل انسانیت کے لیے رحمت کا انقلاب بن کر آئے

اس طرح آپؐ واضح طور پر کُل انسانیت کے لیے رحمت بن کر آئے۔ ابوجہل اگر انسانیت کے لیے زحمت تھا تو حضورؐ رحمۃ للعالمین بن کر آئے اور ایک مکمل انقلاب پیدا کر دیا۔ جب حضورؐ دنیا میں تشریف لائے تو ابوجہل جیسا جاہل، علم سے کورا اور ظالم حکمران تھا۔ حضورؐ دنیا سے 632ء میں تشریف لے گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جیسا عالم اور انسانیت کے لیے امن و امان کا نمونہ، انسانیت کی عزت و احترام کرنے والا رہنما انسانیت کو دے کر گئے۔ کتنا بڑا انقلاب ہے۔ سیاست بدل دی، معیشت بدل دی، تہذیب بدل دی، ثقافت بدل دی، پورا کا پورا تجارت، زراعت، صنعت کا نظام بدل دیا۔ سماجی زندگی کے تمام پہلو بدل دیے اور نئے حقوق کا، انسانی فلاح و بہبود کا ایک قومی اور بین الاقوامی نظام قائم ہوا۔ یہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

ہمارے مسائل کا حل سیرتِ مقدسہ میں ہے

اب اگر اس تناظر میں ہم اپنی سوسائٹی کے مسائل کا ادراک کرنا چاہیں تو یقیناً آپؐ کی سیرتِ مقدسہ میں ہمارے لیے بہت بڑا اُسوۂ حسنہ ہے۔ مسائل کے اِدراک کے لیے سوسائٹی کے بنیادی نظام کا مطالعہ ضروری ہے۔ اور کسی بھی نظام کے تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اُس کی جڑیں کیا ہیں اور کتنی گہری ہیں۔

مسائل کی نشان دہی کا نبویؐ طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے

نبی اکرمؐ نے مکہ کی ریاست میں اُس ظلم کی نشان دہی کی، جو عمرو بن لُحَیٔ نے ڈھائی تین سو سال پہلے مکہ مکرمہ میں اپنی حکمرانی کے زمانے میں قائم کیا تھا۔ اُس نے حکمران بن کر اُس ابراہیمی اور اسماعیلی تعلیم کے حامل مرکز مکہ مکرمہ میں ظالمانہ طور طریقے متعارف کرائے۔ جیسے سود خوری، ظلم اور زیادتی، لوٹ کھسوٹ اور تین سو ساٹھ بت لا کر خانۂ کعبہ میں رکھ دیے۔ یہ بت ان تمام مقدس ہستیوں کے تھے، جو مکہ میں لوگوں کو پانی پلانے، حاجیوں کی خدمت کرنے، لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے والے لوگ تھے۔ یہ لات، منات، عزیٰ کون تھے؟ انسانی خدمت کا اعلیٰ نمونہ اختیار کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے بت اس بنیاد پر بنا کر رکھ دیے کہ اصل میں تو یہ خدا کے ساتھ شریک ہیں، خدا کے کاموں میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اُن کے بت بنا کر مکہ میں لا سجائے۔ نبی اکرمؐ کی آمد سے تقریباً تین سو سال پہلے عمرو بن لُحَیٔ نے مکہ کا نظام بگاڑا تھا۔[26] اس بگاڑ کو حضورؐ نے سمجھا کہ یہاں کفر و شرک ہے، ظلم اور زیادتی ہے، مظلوم ہیں۔ اور ہمیں ان ظالموں کے مقابلے میں جدوجہد اور کوشش کرنی ہے۔

اس تناظر میں پاکستانی نظام کا جائزہ

بالکل بعینہٖ اگر آپ پاکستان کے سسٹم کا جائزہ لینا چاہیں اور آپ پاکستانی معاشرے کے استحکام کے لیے فکرمند ہیں، مسائل کی نشان دہی چاہتے ہیں، تو ہمیں آج سے تین سو سال پہلے کی تاریخ پر جانا ہوگا:

1۔ معاہدات توڑ کر برصغیر پر انگریز سامراج کا ظالمانہ سیاسی تسلط

اس برعظیم پاک و ہند کی تاریخ پڑھنے والے ہم سب جانتے ہیں کہ 1757ء میں سراج الدولہ کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے اہم ترین صوبے بنگال پر قبضہ کیا تھا۔ پھر وہ پورے ہندوستان میں مسلسل غداری، معاہدات کو توڑ کر قبضہ کرتے چلے گئے۔ آئے تھے تجارت کے لیے، قابض حکومت پر ہوگئے۔ ہر کیے ہوئے معاہدے کو توڑا، ان کی خلاف ورزی کی۔ ہمارے سامنے تاریخ موجود ہے۔ 1849ء میں اس پنجاب پر قبضہ ہوا ہے، پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے ساتھ جو معاہدات تھے، وہ توڑے۔ ملتان کے گورنر دیوان مول راج سے جو معاہدات تھے، انھیں توڑ کر ملتان پر قبضہ کیا۔

آپ دیکھیے کہ پھر اس کے بعد 1843ء میں سندھ کے تالپور میروں سے معاہدات توڑ کر حیدرآباد، کراچی اور پورے سندھ پر قبضہ کیا۔ غلامی کی سیاہ رات اس سوسائٹی پر مسلط کردی۔ یہاں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ شان دار دورِ حکومت میں جو عدل و انصاف کا نظام موجود تھا، اُسے توڑ کر یہاں جو سسٹم متعارف کرایا گیا، وہ انسانیت دشمنی کا تھا۔ مالیاتی نظام متعارف کرایا گیا تو سود خوری اور سرمایہ داری کا نظام تھا۔ کیپٹل کی بالادستی کو بنیاد بنا کر پورے معاشیاتی اور مالیاتی قوانین تشکیل دیے گئے۔ لارڈ میکالے کی سفارشات پر 1835ء میں یہاں کا تعلیمی نظام بدل دیا گیا۔ یہاں کے پہلے تعلیم یافتہ تمام لوگوں کو جاہل قرار دے کر انگریزی لازمی کردی۔ اغیار کی زبان سیکھنے کو لازمی اور ضروری قرار دے دیا۔ تعلیم یافتہ وہ شمار ہونے لگا، جو اپنی ماں بولی بولنے کے بجائے سات سمندر پار سے آنے والے حکمرانوں کی بولی سیکھے اور بولے۔ یہ تعلیم کا معیار قرار پایا۔

2۔ ظالمانہ تعلیمی نظام کا تسلط

آپ اُس زمانے کے سکولوں کی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیں، اب تو اس پر بڑی تحقیقی کتابیں آ گئیں۔ آپ طلبا کو انٹرنیٹ پر تمام چیزیں مل جائیں گی۔ خود آکسفورڈ اور کیمبرج نے اس پر تحقیقات اور ریسرچ کرائی ہیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اردو میں اس ریسرچ کو باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں چھاپا ہے۔ نوآبادیاتی دور میں یہاں کا تعلیمی نظام کیسے زہریلا بنایا گیا۔ غلام بنانے کے لیے سسٹم تشکیل دیا گیا۔ 1835ء کا تعلیمی نظام ہو یا 1853ء کی تعلیمی اصلاحات ہوں، یا 1862ء میں دوبارہ تعلیمی اصلاحات کے نام پر تغیر و تبدل کیے گئے ہوں، 1947ء تک تمام تعلیمی رپورٹس دیکھ لیجیے، جس کے ذریعے سے نوآبادیاتی دور میں غلامی مسلط کرنے کا کام کیا گیا۔ اس کو ''تعلیمی دہشت گردی'' کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح ظالمانہ طور پر یہاں کا تعلیمی نظام لوگوں کو مفلوج بنانے کے لیے مسلط کیا گیا۔

3۔ ظالمانہ عدالتی نظام کا قیام

1828ء میں یہاں کا محمڈن کریمنل لاء ختم کر کے برٹش کریمنل لاء نافذ کیا گیا۔ جرائم کو فروغ دینے کے لیے نیا عدالتی نظام بنایا گیا۔ یہاں کی قوم کو غلام بنانے کے لیے وہ عدالتی پروسیجر متعارف کرائے گئے، جس کے ذریعے سے انصاف فراہم نہیں ہونا تھا۔ خود ریاست بہاولپور اور دیگر ریاستوں میں اس نظام کے خالق پینڈرل مون نے انگریزوں کے اعترافات جمع کیے ہیں۔ [27] انگریزوں نے یہ نظام اس لیے بنایا ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے مقدمات میں اُلجھے رہیں۔ اُس کے مطابق سوسائٹی کے اندر یہ لوگ آپس میں دست بہ گریبان رہیں۔ ہماری طرف متوجہ نہ ہوں۔ آزادی اور حریت کا شعور ان میں بیدار نہ ہو۔ ان کے درمیان مقدمے بازی چلتی رہے۔

ابھی آپ نے تین سال پہلے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ سپریم کورٹ کے باہر خیر پور ٹامے والی بہاول پور کے ایک دیوانی مقدمے کا سو سالہ تاریخی تسلسل سامنے آیا۔ 1918ء میں وہ مقدمہ دائر ہوتا ہے اور ابھی تک سپریم کورٹ میں اس کا فیصلہ نہیں ہوا، سو سال ہوگئے۔ مقدمے کے تمام فریقوں نے — جو مقدمہ دائر کرنے والوں کے پوتے نواسے تھے — ستمبر 2017ء میں سپریم کورٹ کے باہر مقدمے کا ننانوے سالہ کیک کاٹا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس مقدمے کو ہمارے دادا پردادا نے دائر کیا تھا اور یہ اب تک چل رہا ہے۔ [28] اس سے اندازہ لگائیے کہ ہمارا عدالتی نظام کیسے تباہ و برباد کیا گیا۔

انتظامی اداروں کی ظالمانہ ساخت کا تسلط

اسی طریقے سے 1861ء میں یہاں کی داخلی سیکیورٹی فورسز پولیس کا سفاکانہ اور ظالم نظام ہماری سوسائٹی پر مسلط کیا گیا۔ حال آں کہ 1857ء میں برطانیہ نے اپنے ملک کے شہریوں کے لیے امن و امان کا ایک بہترین پولیس سسٹم قائم کیا تھا۔ جب کہ ایک ایسا پولیس سسٹم جسے پہلے آئرلینڈ میں نافذ کر کے اس پر قبضہ کیا گیا تھا۔ وہی ظالمانہ پولیس سسٹم ہم پر مسلط کیا گیا۔

1803ء میں یہاں کا بیوروکریٹک سسٹم بدلا گیا۔ ایسا ظلم کا نظام دنیا کے کسی خطے میں نہیں، جو یہاں آپ کے ہاں بیوروکریسی کی صورت میں مسلط ہے۔ 1873ء میں آپ کے لیے جاگیرداری نظام کی اساس پر پانی کی تقسیم کا کینال ایکٹ مسلط

کیا گیا، جس کے نتیجے میں پوری سوسائٹی میں پانی کی غیر منصفانہ تقسیم کی گئی۔ جس میں کاشت کار اور ہاری کے لیے کچھ نہیں، جاگیردار اور غدار کے لیے سب کچھ ہے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ایک ایک مجاہد کو گرفتار کرانے پر یہاں کے جاگیرداروں، گدی نشینوں اور پیروں نے ایک ایک مربع وصول کیا۔ اس حوالے سے ملتان کے گدی نشین اور پیر بڑے مشہور ہیں۔ اس طرح ہر ایک طبقے میں غداری کے نئے طور طریقے متعارف کرائے اور ان کے ذریعے سے ملک وقوم پر غلامی کی سیاہ رات مسلط کی گئی۔

ظالمانہ سیاسی نظام کا تسلط

جب سیاست کے حوالے سے یہاں کے انگریز دور میں اجتماعی نظم ونسق قائم کرنے کی بات کی جائے تو آپ دیکھئے کہ 1891ء کے میونسپلٹی کے نظام سے لے کر 1935ء تک جتنی بھی آئینی اور قانونی اصلاحات یہاں پر نافذ کی گئیں، ان میں یہاں کے عوام کو حقِ خود اِرادیت نہیں دیا گیا۔ جو لوگ انگریزوں کے مفادات کے محافظ تھے، وہی اسمبلیوں میں پہنچتے تھے۔

آپ دیکھئے کہ جیسے عمرو بن لحیؔ نے مکہ کے نظام میں حضورؐ کی آمد سے دو ڈھائی سو سال پہلے کفر اور ظلم پر مبنی خرابیاں پیدا کی تھیں، وہی کام یہاں آپ کے معاشرے میں انگریز سامراج کی غلامی کے زمانے میں ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا۔ ہندوستان ہی کی دولت لے کر ہندوستان کو غلام بنا لیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس خطے کو لوٹ کر بین الاقوامی طاقت حاصل کی، جو دراصل آج دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ماں ہے۔ انٹرنیٹ نے ہر چیز سہولت کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دی۔ آپ طالبِ علم ہیں، ایک کلک سے معلوم کر سکتے ہیں۔ ہر کمپنی کا تسلسل تلاش کیجیے تو سب سے آخر میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملے گا۔ اب تو اس پر کتابیں آ چکی ہیں۔ (29)

آپ مینجمنٹ کے طالبِ علم ہیں، آپ دیکھئے کہ آپ کی سوسائٹی میں معاشی مینجمنٹ کرنے والی کون سی قوتیں ہیں۔ ان کے پیچھے کون ہے؟ وہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا پورا تسلسل ہے، انھیں کے وارثین ہیں، انھیں کے بنائے ہوئے خاندان ہیں، جو وال سٹریٹ پر قابض ہیں، جو آج لندن کی مارکیٹوں پر قابض ہیں، پیرس اور دوسرے تمام سرمایہ دار ملکوں کی مارکیٹ کو جنھوں نے کیپچر کیا ہوا ہے۔ آپ دیکھئے کہ پوری سوسائٹی کو یرغمال بنا لیا گیا۔ اس طریقے سے پوری سوسائٹی میں کفر، ظلم اور غصب کا نظام قائم ہوا۔

اس خطے میں ولی اللّٰہی سلسلے کے حریت پسند علما کا کردار

اس خطے کے حریت پسند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر 1947ء تک یہاں کے رہنماؤں اور علمائے ربانیین نے آزادی اور حریت کے لیے بڑی عظیم جدوجہد کی ہے۔ انھوں نے انبیا علیہم السلام کا مشن سمجھتے ہوئے کہ جیسے انبیاؑ نے حریتِ فکر پیدا کر کے اپنے اپنے خطے میں تبدیلی پیدا کی، اور خاص طور پر امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مکہ میں ایک تبدیلی پیدا کی تو اسی طرح انھوں نے یہاں آزادی اور حریت کی تحریک برپا کی اور دو سو سالہ اس آزادی کی جدوجہد کے نتیجے میں 1947ء میں 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات بارہ بجے دو آزاد ریاستیں قائم ہوئیں۔ ہم نے اُس وقت دعویٰ کیا کہ اسلام کے نفاذ کے لیے ہمیں ریاست چاہیے۔ اس طرح پاکستان کی صورت میں ریاست وجود میں آ گئی۔

ہمارے مسائل کی جڑ غلامی کے نظام کا تسلط ہے

اس 72 سالہ دور میں ہمارے تمام مسائل کی جڑ وہ سسٹم ہے، جو غلامی کے زمانے میں انگریز سامراج نے یہاں بنایا تھا۔ اس غلامانہ سسٹم کا آج نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر حریتِ فکر نہیں رہی۔ ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں رسمی طور پر۔ ڈگری لیتے ہیں، اس لیے کہ ڈگری لینا ضروری ہے۔ آپ کے ایک صوبے کا وزیراعلیٰ (سردار اسلم رئیسانی) بڑے فخر سے کہتا ہے کہ: ''ڈگری ڈگری ہوتی ہے، اصلی ہو یا جعلی ہو''۔ اگر تعلیم کا یہ معیار ہے کہ صوبے کا چیف منسٹر تعلیم کے منہ پر طمانچہ مارتا ہے کہ ہمیں ڈگری چاہیے بس۔ مہارت ہے یا نہیں، سکِل ہے یا نہیں، مینجمنٹ کی صلاحیت ہے یا نہیں، اس سے کوئی غرض نہیں۔

1۔ غلامانہ عدالتی نظام کے پیدا کردہ مسائل

آپ دیکھیے کہ وہی فرسودہ عدالتی نظام ہم پر مسلط ہے۔ آج ہمارے چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں کہ ہم یہاں (انگریز کے) قانون کے مطابق انصاف کرنے کے لیے بیٹھے ہیں، نہ کہ حقیقی طور پر انصاف فراہم کرنے کے لیے۔ ہم عدل و انصاف کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ [30] نیز ایک اَور چیف جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ ہم بہ حیثیت ادارہ قوم کو عدل و انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہوچکے ہیں۔ [31] سوال یہ ہے کہ 1947ء سے لے کر اب تک کے ذمہ دار کون ہے؟ اس کا تعین بھی تو آپ کریں۔ کیا یہ وہی نظام نہیں ہے، جو انگریز نے 1828ء میں قائم کیا تھا؟ آپ کی پارلیمنٹ کو کس چیز نے روک رکھا ہے کہ آپ نیا عدالتی نظام نہیں بنا سکتے؟

2۔ غلامانہ زرعی نظام کے پیدا کردہ مسائل

آپ مینجمنٹ کے طالبِ علم ہیں۔ معاشی مینجمنٹ، سیاسی مینجمنٹ اُس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک کہ کسی ملک کا بندوبستِ اراضی، اُس میں موجود معدنی وسائل کی نشان دہی نہ ہو۔ اب یہاں 1924ء میں بندوبستِ اراضی ہوا تھا، اس کے بعد آج 2019ء آگیا، تقریباً سو سال ہوچکے ہیں۔ کیا اس سو سال میں ہمارے سماج نے کوئی ارتقا نہیں کیا؟ ہمارا سماج آگے نہیں بڑھا؟ شہر بڑھ گئے، علاقے پھیل گئے۔ ہر شہر کے اندر آبادی بڑھ گئی، ہر گاؤں میں تبدیلیاں آگئیں، لیکن ہمارے پاس اس کی تفصیلات نئے بندوبستِ اراضی کی صورت میں موجود نہیں ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے محکمہ ریونیو کے پاس کوئی ڈیٹا اور کوئی ریکارڈ نہیں۔ ہم نے آزاد قوم کی حیثیت سے کوئی نیا نظام نہیں متعارف کرایا۔

آج بھی ہمارا پورا زرعی نظام اور اُس کا ریونیو کلیکشن سسٹم اکبراعظم کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ یہ آج پٹواری کا ریکارڈ، جس سے فردِ ملکیت جاری کی جاتی ہے، یہ پٹواری، گرداور، تحصیل دار، یہ اکبراعظم نے بنائے۔ پانچ سو سال پرانا نظام کیا نئے دور کے چیلنجز کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ پرانے ریونیو نظام کی جو بنیاد تھی، وہ سرسائی، مرلے، کنال اور ایکڑ پر تھی۔ جو نو پر تقسیم ہوتا ہے۔ اور جدید دنیا اعشاری نظام یعنی دس پر تقسیم کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ ہمیں بڑا فخر ہے کہ ہم نے اراضی کا ریکارڈ کمپیوٹرائز کردیا ہے۔ ہمارے چیف منسٹر بڑے فیتے کاٹتے ہیں کہ ہم نے سارا ریونیو نظام کمپیوٹرائزڈ کردیا۔ کیا صرف اراضی کا ریکارڈ سکین کرنے کا نام کمپیوٹرائزڈ کرنا ہے؟ پہلے آپ جدید اصولوں پر بندوبستِ اراضی کریں اور مینول سسٹم تو بنائیں کہ اعشاری نظام پر زمین کی تقسیم

برابر اور مساوی ہو۔ آج فرد نکلتی ہے اور اُس کے اندر پوائنٹ کے بعد کتنے اعشاریہ اور کتنے اعداد ہوتے ہیں؟ جب اعشاری نظام پر پہلے مینول سسٹم بنے گا تو کمپیوٹرائزڈ ہو کر کوئی نتیجہ پیدا کرے گا۔ زمینوں کی جھگڑے،لڑائیاں اور ان لڑائیوں کے ذریعے سے یہاں کا مافیا جو کمائی کر رہا ہے، مسائل کھڑے کرتا ہے، اُن مسائل کے حل کرنے کے لیے تو درست مینجمنٹ کی ضرورت تھی۔

3۔غلامانہ معاشی نظام کے پیدا کردہ مسائل

اسی طرح معاشی نقطہ نظر سے ہماری صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کا پہلا بجٹ 21رفروری 1948ء کو پیش کیا گیا۔ یہ بجٹ ملک کے پہلے وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد نے چالیس رُکنی دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا تھا۔ پہلا بجٹ ہی دس کروڑ روپے خسارے کا تھا۔ کتابوں کے مطابق 89 کروڑ کا کل بجٹ پیش کیا گیا۔ 79 کروڑ آپ نے کہا کہ ہمارے پاس کسی طریقے سے آ گئے اور جس طریقے سے آئے، اُس کے بھی کھاتوں کی اگر پڑتال کی جائے تو ایران کے راستے سے شہنشاہِ ایران نے آپ کو بھیک دی، وہ ایک الگ کہانی ہے۔ ہم کاغذ پر موجود بجٹ کی بات کرتے ہیں کہ آپ نے کہا 79 کروڑ ہماری آمدن ہے اور 89 کروڑ کا آپ بجٹ پیش کر رہے ہیں۔ 10 کروڑ کا خسارہ 1948ء کے بجٹ میں ہوا۔ اور وہ دن اور آج کا دن، 400 کھرب روپے کا قرضہ آپ پر مسلط ہے۔ ہر آنے والا بجٹ قرضے سے بنتا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضہ لیتے ہیں، دوسرے ملکوں کے سامنے بھیک مانگتے ہیں۔ اس طرح اپنا ہر آنے والا بجٹ بناتے ہیں۔

4۔ بڑھتے ہوئے قرضوں کے مسائل

قرآن تو کہتا ہے جہاں بھوک اور افلاس اور قرضوں کی مئے پی جاتی ہو، وہ زوال پذیر معاشرہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے تو مقروض کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ: ''صلّوا علیٰ صاحبِکم'' [32]، اپنے ساتھی کی خود نماز پڑھ لو، میں اس کی نماز نہیں پڑھوں گا۔ قرض کا معنی ہے کاٹنا۔ قرض کو عربی میں ''قرض'' بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ کاٹتا ہے۔ یہ تعلقات کو، رشتوں کو، ایک دوسرے کے ساتھ رشتوں کو منقطع کرتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ قرض کی لعنت ہم نے اپنے اوپر مسلط کی ہے۔

5۔ کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کے مسائل

ہماری معاشی صورتِ حال یہ ہے کہ ہر سال ترقیٔ معکوس کے ساتھ ہمارے قرضے کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ باہر سے قرضہ آتا ہے ملک اور قوم کو ترقی دینے کے لیے اور ہمارے منتخب یا غیر منتخب حکمران طبقے یہاں سے لوٹ کر دولت وہیں پر برطانیہ پہنچاتے ہیں، وہیں کوٹھیاں بنگلے خریدتے ہیں۔ اگر پہلے انگریز ہندوستان لوٹ کر دولت باہر پہنچا رہے تھے تو آج یہاں کا حکمران طبقہ ہمارے اوپر قرضے مسلط کر کے وہی پیسے دوبارہ اُن کے پاس پہنچا دیتا ہے یا دبئی پہنچا دیتا ہے۔ کیوں؟

6۔ سیاسی حوالے سے گھمبیر ہوتے مسائل

اسی کے ساتھ آپ اپنے سیاسی نظام کو دیکھیے کہ 1947ء کے بعد 1970ء تک تو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کوئی الیکشن نہیں ہوا۔ تقسیم سے پہلے 1946ء میں الیکشن ہوا تھا۔ وہ بھی مخصوص افراد کے ووٹوں سے اسمبلی کے نمائندے منتخب کیے گئے۔ 1947ء کے بعد صرف بلدیاتی سطح کے کچھ الیکشنز ہوئے۔ پہلی مرتبہ 1970ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پہلا الیکشن ہوتا ہے۔ اور آج

یہ تیرھواں الیکشن ہے، جو ابھی پچھلے سال 2018ء میں آپ کے ہاں ہوا۔ ہر الیکشن میں ہارنے والی پارٹی کہتی ہے فراڈ ہوا، دھوکا ہوا، دھاندلی ہوئی۔ گویا ہر الیکشن کے بعد اسمبلیوں کے نتائج کو سوالیہ نشان بنا کر رکھ دیا گیا۔

مسائل کی بنیادی بات یہ ہے کہ ہم نے ظلم کے یہ تمام پہلو قبول کیے ہوئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی اجتماعی کاوش ہم نے نہیں کی۔ اس پر ہم نے سنجیدہ طور پر غور و فکر نہیں کیا۔

ان مسائل کے حل کرنے کی شعوری کوشش کیوں نہیں؟

آپ دیکھئے کہ سیاسی حوالے سے اگرچہ ملک میں پارلیمنٹ موجود ہے، لیکن پارلیمنٹ کوئی آئین اور قانون بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ نہ عدالتی نظام بدلتی ہے، نہ مالیاتی نظام بدلتی ہے، نہ سودخوری کا سسٹم ختم کرتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل بنائی، 6 ہزار سفارشات ٹیبل پر موجود ہیں، اسمبلی میں پیش نہیں کی جا رہیں۔ جب 1973ء میں آپ نے آئین منظور کیا تو اس ملکی آئین میں کہا گیا دس سال بعد اُردو ہماری قومی زبان ہوگی۔ آج بھی وہ اُسی طرح ذلیل و خوار ہو رہی ہے۔ آئین میں کہا گیا آپ کا سودی نظام دس سال میں ختم کر دیا جائے گا، 1983ء میں یہ دس سالہ دور بھی گزر گیا۔ پھر ایک آمر مطلق نے مزید دس سال کی مدت بڑھا دی۔ اس کے بعد آج تک چالیس پچاس سال کا عرصہ گزر گیا۔

آپ دیکھئے کہ کس طرح ملکی مسائل کی نشان دہی کرنے میں اجتماعی طور پر ہماری نااہلیت ثابت ہوئی۔ اور ان مسائل کے حل کرنے کے لیے جو حکمتِ عملی ہونی چاہیے، وہ بھی ہم سے غائب ہے۔

سیرتِ نبویؐ ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ آپؐ کی سیرت کی روشنی میں ہم — بالخصوص جو تعلیم یافتہ نوجوان ہیں — اپنی سوسائٹی کے مسائل کا درست ادراک کریں۔ ہماری تعلیم کا ہدف حریتِ فکر ہو۔ تخلیقی صلاحیت پیدا کرنا ہو۔ محض تقلیدی عمل نہ ہو۔ عقل و شعور سے چیزوں کو سوچنا اور پرکھنا ہو۔ مسائل کی اجتماعی نقطہ نظر سے نشان دہی کی جائے۔ اُن کے حل کے لیے جو نبی اکرمؐ نے طریقۂ کار اختیار کیا کہ مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے خلاف مزاحمت، اجتماعی نظام کو اجتماعی نقطہ نظر سے قائم کرنے کی سوچ اور فکر ہماری زندگی میں آئے۔ ہم عدل، امن اور معاشی خوش حالی کے خوگر بنیں۔ ہم سوسائٹی کے مفید شہری بنیں۔ تعلیم ہمارے اندر یہ بلندی پیدا کرے کہ ہم فرقہ واریت، نسل پرستی، دہشت گردی، مذہبی افتراق و انتشار کے دائرے سے نکل کر اجتماعی مسائل کو اجتماعی انسانی بنیادوں پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کے حامل ہوں۔

ہم نے پہلے دیوار کھڑی کی کہ مسلمان اور غیر مسلم کا جھگڑا، پھر مسلمانوں کی اُن کے درمیان درجہ بندی کی۔ اگر مذہبی شناخت رکھتے ہیں تو فرقوں کا جھگڑا اور اگر مذہبی شناخت نہیں رکھتے تو نسلوں اور زبانوں کا جھگڑا، لسانی فرقہ واریت، یا نسلی فرقہ واریت کے زیر اثر ہم ووٹ لیتے اور دیتے اور حکومتی نظام کا حصہ بنتے ہیں۔

دینی اور قومی حوالے سے طلبا کی شعوری ذمہ داریاں

درس گاہوں اور جامعات میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے حریتِ فکر، عقل و شعور اور فہم و بصیرت کے ساتھ اپنے اجتماعی مسائل کا خود ادراک کریں۔ تخلیقی صلاحیتوں کے

ساتھ نبی اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے اجتماعی مسائل کے حل کرنے کے لیے کردار ادا کریں۔ تبھی ہم پاکستان کو استحکام دے سکتے ہیں۔ اب یہ ریاست مستحکم ہونے کی منتظر ہے۔ استحکامِ پاکستان ہماری سب کی قومی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ آپ پاکستان سے باہر جہاں بھی جائیں گے، کوئی عزت نہیں پائیں گے۔ آپ تعلیم حاصل کر کے امریکا چلے جائیں، برطانیہ چلے جائیں، سعودی عرب چلے جائیں، دوسرے درجے کے شہری ہوں گے۔ وہاں آپ کے سیاسی اور معاشی حقوق سلب ہوں گے۔

اب تو شناختی کارڈ کا بین الاقوامی نظام آ گیا ہے۔ اس کے مطابق آپ پاکستانی نژاد ہیں۔ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے ملک میں چلے جائیں، آپ کی شناخت پاکستانی کی حیثیت سے ہوگی۔ پاکستان کی عزت ہے تو آپ کی عزت ہے۔ اور اگر آپ کے پاکستان کی عزت نہیں ہے، یہاں کا سسٹم خراب ہے، یہاں بگاڑ موجود ہے، یہاں ظلم ہے، یہاں معاشی بدحالی ہے، یہاں بدامنی ہے، یہاں دہشت گردی ہے تو آپ کتنے ہی ذاتی طور پر نیک ہوں، دنیا کے جس ائیرپورٹ پر اُتر کر آپ پاسپورٹ دکھائیں گے، آپ کو لائن سے الگ کر دیا جائے گا۔ جوتے دکھاؤ، کپڑے اُتار کر دکھاؤ کہ کوئی ہیروئین تو نہیں لے کر آ رہے۔ آپ کا وزیراعظم، وزیرخارجہ، وزرا امریکا کے ائیرپورٹ پر چار چار گھنٹے ذلیل کیوں ہوتے ہیں؟ ملک کی عزت ہو، وقار ہو، شناخت ہو، طاقت اور قوت ہو تو کسی کی میلی نظر ہمارے قومی وجود پر نہیں پڑ سکتی۔ ہمارے قومی وجود کی بقا ہمارے قومی اور دینی شعور پر ہے۔ نوجوان طاقت جو اگلے دور میں قیادت کے منصب پر فائز ہو، اس کی اجتماعی تنظیم اور اس کا شعور ہی ایک نتیجہ پیدا کرے گا (آمین!)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سیرتِ مبارکہ کو سمجھنے اور اس کے تناظر میں اپنے مسائل کو حل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

سوالات و جوابات

(لیکچر کے اختتام پر طلبا نے اپنے سوالات براہِ راست پیش کیے، جن کا حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے تسلی بخش جواب دیا۔ اس کی تفصیل قارئینِ ''شعور و آ گہی'' کے مطالعے کے لیے پیشِ خدمت ہے۔ ادارہ)

سوال: میرا تعلق سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ سر جس طرح آپ نے کہا کہ مدینہ کی جو ریاست تھی، اس میں عقیدے کی کوئی ریاستی انٹرفیرنس نہیں تھی۔ تو سر کیا ہم مدینہ کی ریاست کو ایک سیکولر ریاست کہہ سکتے ہیں؟

جواب: دیکھیے! ایک ہے رواداری اور برداشت کی بنیاد پر انسانی مسائل کے حل کرنے کا عمل۔ اور ایک سیکولرازم کی اصطلاح کا وہ پس منظر ہے، جو یورپ میں مذہبی پاپائیت کے خلاف استعمال کیا گیا کہ وہاں کی پاپائیت، وہاں کا مذہب انسانی مسائل حل کرنے سے قاصر تھا۔ تو یورپین لوگوں نے اس سے آزادی حاصل کرکے لامذہبیت اور لادینیت کی بنیاد پر اپنی سوسائٹی کے مسائل حل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ سیکولرازم کی اصطلاح کا پس منظر ایک خاص یورپین معاشرت کا رہا ہے۔ ایشیائی قوموں کی شناخت یہ ہے کہ اُن کے سامنے مذہبی رواداری کا تصور رہا ہے کہ مذہبی برداشت کے ساتھ انسانی مسائل حل کیے جائیں۔ مذہب کی نفی نہیں ہے۔ مذہب کی شناخت کے ساتھ اُن کے جو اجتماعی، سیاسی، معاشی مسائل ہیں، اُن کو حل کرنے کے لیے کردار ادا کیا جائے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ جو خود نبی ﷺ ہیں، جن پر اللہ کی کتاب نازل ہوئی ہے، وحیِ الٰہی جن پر نازل ہوئی اور وہ اللہ کی جانب سے دیے ہوئے علم کی بنیاد پر انسانی مسائل حل کر رہے ہیں، وہ مذہب کے بانی ہیں۔ ان کے کام کو سیکولر کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آج جو مذہب کا بنیادی تصور پیدا ہو چکا ہے، وہ رسمیت کا ہے۔ کسی سوسائٹی میں ایسے مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جو ظلم کا نمائندہ بن کر آئے۔ وہ مذہب جو انسانی مسائل کے حل کرنے کے لیے آیا ہے، اُسے ''دین'' کہا گیا ہے۔ دین اجتماعی مسائل کے حل کرنے کا شعور دیتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے اُس کی اساس پر ریاست قائم کی۔ خود اللہ پاک نے کہا ہے: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (33) ہم نے آپ کو دینِ حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ آپ اسے تمام ظالمانہ نظاموں پر غالب کریں۔ آپؐ نے اس دینِ حق کو مدینہ کی ریاست میں روبہ عمل لاکر انسانی مسائل حل کیے ہیں۔

سوال: میں لاء ڈیپارٹمنٹ کا طالبِ علم ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ جس فکر کی آپ نے بات کی، اس فکر کے پرچار کے لیے سٹوڈنٹس اور انسٹیٹیوشنز پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ اور فکر سے زیادہ عمل کی اِمپورٹنس (اہمیت) ہوتی ہے تو ہم اس فکر کو کیسے عمل میں ڈھال سکتے ہیں۔

جواب: دیکھئے! جب تک آپ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں، آپ کا عمل پڑھنا اور سمجھنا ہے۔ اب ایک آدمی اگر میڈیکل سائنسز پڑھ رہا ہو تو اُسے کہا جائے کہ جی تم پڑھ تو بہت کچھ رہے ہو، عمل کیوں نہیں کر رہے؟ بھئی! عمل تو جب پانچ سال پورے ہوں گے، پورا علم حاصل کر لے گا، میدانِ عمل میں اُترے گا، اُس وقت اُس کی عملی ذمہ داری ہے۔ تعلیم کے زمانے میں تو ہمارا عمل یہی ہے کہ جس علم کو حاصل کر رہے ہیں، اُس کو نظریے کے ساتھ، شعور کے ساتھ، اعلیٰ مقاصد کے ساتھ، انسانی خدمت کی اساس پر حاصل کریں۔ علم کے تمام زاویے، حقائق کا ادراک کرنا، ان پر غور و فکر کرنا، مسائل سمجھنا، مسائل کی درجہ بندی کرنا، اُس کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا، تعلیم کے زمانے میں آپ کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے۔ اگر یہ تعلیمی کردار آپ نے صحیح طریقے سے حاصل کر کے اپنے اندر مہارتیں حاصل کر لیں تو ضرور نتیجہ پیدا ہوگا۔ لیکن اگر چار پانچ سال یہاں گزارے اور علم میں یہ مہارت پیدا نہیں کی اور یہاں آپ ابھی سے عمل کے اندر پڑ گئے تو علم مکمل طور پر نہیں آتا۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوتا ہے۔ اس وقت میں تعلیم کے زمانے میں تعلیم کو اعلیٰ سطح پر حاصل کرنے کی جدوجہد اور کوشش کرنی چاہیے۔

سوال: میرا تعلق ماس کمیونی کیشن سے ہے۔ میں نے ایک حدیث سنی ہے اور اس کے تناظر میں میرا سوال ہے۔ حدیث یہ ہے کہ اسلام جب غالب آجائے تو وہ کفار یا غیر مسلم کے لیے تین شرائط رکھتا ہے کہ وہ یا جزیہ دیں، یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، یا مسلمان ہو جائیں۔ تو اگر یہ سچ ہے تو جو غیر مسلم ایک ریاست کے اندر رہتا ہے اور وہ پُرامن بھی ہو تو ابھی آپ نے کہا کہ اسلام کی لڑائی ظالم سے ہے، کافر سے نہیں ہے۔ تو ان دونوں میں جو تضاد نظر آتا ہے، اُس کے بارے میں آپ رہنمائی کریں۔

جواب: آپ ؐ کا عمل یہ تھا کہ جب آپ ؐ جہاد کے لیے کوئی لشکر کسی بستی کی طرف بھیجتے تھے تو سب سے پہلے اُسے دعوت دی جاتی تھی کہ وہ دین کے مکمل ایسے سسٹم کو قبول کرے، جس سے دنیا کا بھی فائدہ ہو اور آخرت کا بھی فائدہ ہو۔ دنیا میں بھی ترقی ہو اور آخرت میں بھی موت کے بعد بھی اُس کے لیے اچھے نتائج سامنے آئیں۔ کلمہ پڑھ لے، مسلمان ہو جائے۔ گویا کہ دینِ اسلام ایک مکمل پروگرام ہے، جو صرف دنیا ہی نہیں، بلکہ آخرت کے فائدے کے لیے بھی ہے۔

اچھا! اب اگر ایک آدمی یہ آپشن اختیار کرتا ہے کہ نہیں جی! میں مکمل مسلمان نہیں ہوتا، کلمہ نہیں پڑھتا تو اُس کے بعد دوسرا آپشن رکھا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے، آپ مسلمان نہیں ہونا چاہتے، ہم آپ کو زبردستی مسلمان نہیں بنائیں گے۔ لیکن ایک عدل و انصاف کا نظام قائم رکھنا، ریاست کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے کہ آپ ہمارے ڈسپلن کو، جس کا تعلق سیاسی امن سے ہے اور معاشی ترقی کے اُن اقدامات سے ہے، جن کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، آپ اس ڈسپلن کو قبول کریں گے۔ اور ظلم اور کفر کا جو سیاسی اور معاشی نظام ہے، اُس کا آپ کو انکار کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ظلم انسانیت کے لیے بہت بڑا جرم ہے اور ظلم کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہے۔ اب جب آپ ہماری ریاست کا حصہ بنیں گے تو اس ریاست کی تشکیل اور اس کے اخراجات کے لیے، امن و امان کے لیے لازمی ہے کہ آپ کے پاس وسائل ہوں۔ جیسے مسلمان زکوٰۃ بھی دیتا ہے اور جان بھی دیتا ہے۔ اُسے جہاد میں فوجی خدمات بھی سرانجام دینی ہیں اور زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہے، بلکہ اگر زکوٰۃ سے زائد بھی ریاست کو ضرورت ہو تو مسلمان دے گا۔

اب کافر سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ٹھیک ہے آپ غیر مسلم رہنا چاہتے ہیں تو رہیں، ہمارے ملک میں امن سے رہیں۔ ہم آپ

سے کوئی فوجی خدمات بھی نہیں لیں گے، لیکن ہم آپ کو سیکیورٹی دے رہے ہیں، امن وامان دے رہے ہیں، آپ کے لیے عدل و انصاف کا ماحول پیدا کر رہے ہیں تو اس کے لیے آپ کو ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ جزیہ ایک ٹیکس ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے آپ کا امن وامان کا سسٹم قائم کیا جاسکے۔ دنیا کے ہر ملک میں اور خود کفر کے نظام میں بھی یہ ٹیکس موجود تھا، بلکہ مسلمانوں نے آکر تو اس ٹیکس کی شرح بہت ہی کم کردی۔ کسریٰ ایران جو ٹیکس لیتا تھا، عمر فاروقؓ کی حکمرانی میں جب یہ لوگ آئے تو حضرت عمرؓ نے اس کا نصف، بلکہ اس سے بھی کم ان کے اوپر ٹیکس نافذ کیا۔ اس کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ نہیں صاحب! ہم آپ کے امن وامان کا سیاسی نظام قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، ہم قیصر و کسریٰ کا جو ظلم کا نظام ہے، اس ظلم کے نظام کو طاقت کے بل بوتے پر قائم رکھیں گے اور ہم آپ سے لڑیں گے۔ لڑنے پر وہ آمادہ ہوں گے تو پھر ہم آپ سے جہاد اور لڑائی کریں گے۔ یہ تیسرا آپشن آخری ہے۔

حالات و تعلیمات کی ایک ترتیب سمجھنی چاہیے کہ یہ واقعہ کیسے وقوع پذیر ہوا اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ چوں کہ باقی تمام شعبوں میں تو علم حاصل کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ میڈیکل سائنسز ہے، مینجمنٹ ہے وغیرہ، لیکن قرآنی اور نبی اکرمؐ کی سیرت سے متعلق جو علمی سسٹم ہے، اس کا علمی منہج ہے، اس کو علم ہی نہیں سمجھتے۔ اور سب سے بڑی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے مذہبی علما بھی اس کو چند رسومات کا مجموعہ سمجھ کر ہی بیان کرتے ہیں۔ کسی علمی میکانزم، کسی اجتماعی نظام کے تحت اس پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ وہ جو کچھ بیان کر رہے ہوتے ہیں، انھیں خود اس کے سیاسی، معاشی، سماجی نتائج پر توجہ نہیں ہوتی۔ ہر آدمی کسی طریقے سے بیان کرنا چاہے، کردے، اور جو چاہے جیسے مرضی ہو، نتائج اخذ کرلے، یہ طریقہ درست نہیں۔

یاد رکھیے! دینِ اسلام کا ایک پورا سسٹم ہے۔ اس کا ایک علمی طریقۂ کار ہے۔ ایسے نہیں ہے کہ جناب آپ یہ نہیں کریں گے تو ہم تم سے لڑنا شروع کردیں گے۔ کفر کی بنیاد پر لڑنا ہوتا تو جب وہ کلمے کا انکار کرتے ہیں، جزیہ مانگے بغیر ہی لڑ کر، مار کر اُن کا مال چھین لیا جائے تو جزیے سے زیادہ مال آئے گا یا نہیں۔ جب ٹیکس لے کر آپ اپنی ریاست میں اُس کو پُرامن رہنے کی اجازت دے رہے ہیں تو یہ اُن کے لیے عین انصاف ہے۔ دنیا میں کون سا سسٹم ہے، جو بغیر ٹیکس کے چلتا ہے؟

سوال: میرا تعلق انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز ہے۔ میں تین سوالات پوچھنا چاہتا ہوں:

1۔ انٹرنیشنل لیول پر مسلمانوں میں جیسے آپ نے بات کی، پاکستانی جاتے ہیں تو تین چار گھنٹے چیکنگ ہوتی ہے۔ لیکن لاسٹ ڈے میں دو تین دن پہلے جب انڈیا کے ایک اداکار شاہ رُخ خان امریکا گئے، اُن کی بھی تین چار گھنٹے چیکنگ ہوئی تھی۔ یہ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ہی ہے، یا اس میں کچھ دوسرے عناصر بھی ہیں؟ آپ بتائیے گا۔

2۔ پاکستانی معاشرے کے استحکام کے لیے، یا کسی بھی معاشرے کے استحکام کے لیے سب لوگوں کو ایک پیج پر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن پاکستانی علما ہی جب ایک پیج پر نہیں ہوں گے تو کیسے استحکام آئے گا؟

3۔ آخری سوال کہ اسلام نے روڈ بند کرنے اور لوگوں کو پریشان کرنے کا کبھی درس نہیں دیا، لیکن جو لوگ اسلام کے نام پر سیاست میں ہیں، وہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: بھئی! ہم سارے ممالک اس وقت جو جنوبی ایشیا کے ہیں، وہ غلام ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ اور اُن ممالک کی

www.rahimia.org

شناخت اُن عالمی سامراجی طاغوتی قوتوں کے نزدیک ایسی ہے کہ وہ اُن کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، وہ ایسا ہی ظالمانہ ہے۔کم از کم ہماری غیرت تو جاگنی چاہیے۔ اور اگر مسلمان ہونے کے ناطے بھی شاہ رُخ خان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے تو پھر مسلمانوں کی غیرت بھی جاگنی چاہیے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی عزت اور شناخت پیدا کرنے کے لیے ہم نے کیا جدوجہد اور کوشش کی؟

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے، تو بھئی! علما ہی نہیں، ماشاء اللہ یہاں کے جہلا بھی ایک پیج پر نہیں ہیں۔ گریجویٹ بھی ایک پیج پر نہیں ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ مولوی تو فتوے لگاتے ہیں کہ جو اُن کے فرقے کو نہیں مانتا، اس کو کافر قرار دیتے ہیں۔ اور یہاں کی جو لیڈر شپ ہے، جو اُن سے سیاسی اختلاف رکھے تو وہ غدار ہوتا ہے۔ سیاست میں غداری کے فتوے لگتے ہیں۔ پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کا جو نظامِ تعلیم ہے، وہ فرقہ وارانہ ہے۔ وہ طبقاتی ہے۔ چاہے وہ پانچ مدرسوں کے بورڈ ہوں، وہ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ اور مودودی صاحب کے ماننے والوں کا جماعتِ اسلامی کا وفاق ہے تو ان میں سے پانچ طرح کے مذہبی لوگ نکل رہے ہیں۔ ایسے ہی اگر آپ عصری نظامِ تعلیم کو دیکھئے تو ایچی سن کالج ہے، لارنس کالج ہے، ایف سی کالج ہے، عام یونیورسٹیاں ہیں، پھر جو پرائیویٹ آکسفورڈ سکول سسٹم ہے، فلاں سسٹم ہے، دس بارہ کے قریب سسٹم ہیں۔

ایک پیج پر ہمارا نظامِ تعلیم نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس نے اپنے تمام لوگوں کے لیے ایک نظامِ تعلیم نہ رکھا ہو۔ امریکا میں ایک نظامِ تعلیم ہے۔ ہر امریکی شہری کو یہودی ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، اُسے وہی ایک نظامِ تعلیم پڑھنا ہے۔ کسی کو پرائیویٹ طریقے سے اپنا نیا نظامِ تعلیم بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ چین ہے، وہ ایک نظامِ تعلیم رکھتا ہے۔ روس ہے، وہ ایک نظامِ تعلیم رکھتا ہے۔ پاکستان میں دس طرح کے نظامِ تعلیم کو ہم نے اجازت بھی دی ہوئی ہے، بلکہ تعلیمی مافیاز کو طلبا کو لوٹنے اور اُن کے والدین کی جیبیں خالی کرنے کی بھی اجازت دی ہوئی ہے۔ طبقاتی تعلیمی نظام ہمارے ایک پیج پر نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ چاہے علما ہوں، انجینئرز ہوں، ڈاکٹرز ہوں۔

آپ کسی سرکاری محکمے میں چلے جاؤ، اس محکمے میں اگر دس کلرک ہیں تو دس کے دس قبلہ و کعبہ ہیں۔ پانچ چھ افسر ہیں تو ہر ایک کی اپنی اپنی ایک دوسرے کے ساتھ ٹھنی ہوئی ہے۔ کسی میڈیکل کالج میں چلے جاؤ، کسی یونیورسٹی میں چلے جاؤ، کھینچا تانی ہے۔ انفرادیت کا مرض پیدا ہوگیا۔ سرمائے کی ہوس اور سرمایہ لوٹنے کا عمل ہے۔ تو جب کوئی قوم اس چکر میں پڑ جائے تو اس میں وحدتِ فکری کیسے پیدا ہوگی؟ ہمارے مسائل کے حل میں سب سے اہم بات یہ بھی ہے کہ ہم اپنی قومی اُمنگوں اور ملّی تقاضوں کے مطابق یکساں نصابِ تعلیم اور یکساں نظامِ تعلیم قائم کریں۔ ہم مسلمان ہیں، حضورؐ کے اُمتی ہیں، قرآن اور حدیث اور سنت کے ساتھ ساتھ ہمیں علاج معالجے کی ضرورت ہے۔ ہمیں قومی سطح پر عمارتیں اور بلڈنگیں بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سائنس میں ترقی کی ضرورت ہے۔ ہر شعبے میں ہمارے ماہرین موجود ہوں اور ایک نظامِ تعلیم ہو اور ایک چھت تلے ہم پڑھیں۔ تب ہماری قوم میں وحدتِ فکری پیدا ہوگی۔ سوسائٹی مجموعی طور پر ترقی کرے گی۔ ورنہ تو ایسے ہی حال رہے گا۔

تیسری بات آپ نے پوچھی ہے۔ ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ جو علما اپنی سیاست کے لیے عام انسانوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ غلط کرتے ہیں۔ حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے: ''إیّاکم و الجُلوسَ بالطُّرُقات'' [34] (خبردار! راستوں پر نہ بیٹھا کرو)۔ اگر

مولوی صاحبان خود پڑھنے پڑھانے کے باوجود بھی راستے روک رہے ہیں تو کم از کم اس حدیث کو تو دیکھنا چاہیے کہ: ''خبردار! راستوں پر مت بیٹھو''۔ جب کہ راستوں کے بارے میں حضوؐر نے فرمایا کہ راستے کھلے رکھو۔ اُس زمانے میں اونٹ ایک بڑی سواری سمجھا جاتا تھا۔ اُس پر بوجھ لادنے کی وجہ سے اُس کی جو چوڑائی ہوتی تھی، تو حضوؐر نے فرمایا کہ دو اونٹ آسانی سے سڑک سے گزر جائیں۔ اتنی چوڑی سڑک ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ لوگ کیا کرتے تھے کہ دروازے کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ اپنے دروازے کے سامنے چارپائی بچھائی، وہاں بیٹھ گئے۔ حضوؐر نے اُس سے منع کیا کہ راستے مت روکا کرو۔ تو کچھ صحابہؓ نے کہا کہ جی ہمارے گھر بڑے تنگ ہیں۔ بسا اوقات کوئی مہمان ملنے آجاتا ہے تو ہمیں مجبوراً باہر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تو حضوؐر نے فرمایا کہ:

''فإذا أبيتم إلّا المجلس فأعطوا الطّريق حقّه''. [35]

(اگر مجبوری سے کسی وقت بیٹھنا بھی پڑے تو راستے کا حق ادا کرو۔)

ہر چلنے والے کا راستہ مت روکو۔ ہر گزرنے والے کو سلام کرو۔ اور خواتین خصوصاً گزر رہی ہیں تو نگاہیں نیچی رکھو۔ تو راستے کے آداب بیان کیے ہیں۔ بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ سماجی زندگی سے متعلق جو ہمارے فرائض اور واجبات نبی اکرمؐ نے بتلائے ہیں، اُن کو ہم نے چھوڑ دیا۔ بس حلوہ کھانے کی سنت یاد ہے، پگڑی پہننے کی سنت یاد ہے، خوشبو لگانے کی سنت یاد ہے، جن کاموں سے انسانوں کو اذیت پہنچتی ہے، اُن سے حضوؐر نے روکا، وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ آج کل کے اپوزیشن میں موجود علما کی سیاسی لڑائی حکومت سے ہے اور دھرنا دے کر راستہ عوام کا روک رکھا ہے۔ ایسا کرنا قطعی طور پر غلط بات ہے۔

سوال: میرا تعلق ڈی وی ایم ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ ہمارے ہاں ایک یہ کنسپٹ پایا جاتا ہے کہ جہاد کا حکم اسلامی ریاست دے گی اور وہی تعین کرے گی کہ جہاد کی کہاں ضرورت ہے؟ کس کے خلاف ضرورت ہے؟ کس وقت ضرورت ہے؟ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے قوانین اسلامی قوانین سے متصادم بھی ہیں۔ تو کیا اس صورت میں ہم یہ قبول کر سکتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے؟ اور اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ یہ جہاد کا وقت ہے یا نہیں؟ اور وہ علاقے کا اور فرقے کا تعین کرے گی کہ کس کے خلاف یہ سب کچھ ہونا ہے؟

جواب: پہلے تو جہاد کو سمجھیے کہ جہاد کیا ہے اور کیوں ہے؟ پہلے جہاد کی فرضیت کے مقاصد و اہداف ہمیں معلوم ہونے چاہئیں۔ اور جہاد کا جو بنیادی پس منظر ہے، وہ سامنے آنا چاہیے۔ اب آپ بتلائیے کہ تیرہ سال نبی اکرمؐ مکہ مکرمہ میں رہے تو آپؐ کو قتال کرنے سے روک دیا گیا۔ كُفُّوٓا اَيۡدِيَكُمۡ [36]۔ حکم دیا گیا کہ ''اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو''۔ دیگر جو اعمال تھے، توحید کا نظریہ ہے، تربیت ہے، اَخلاق سازی ہے، وہ نبی اکرمؐ نے سکھائی۔ جہاد کا فریضہ کب ہوا؟ جب نبی اکرمؐ مدینہ منورہ پہنچے اور ریاست کے سربراہ بنے، تب آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ اب جہاد کریں۔ اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا [37] اور جہاد سے متعلق احکامات آئے۔ اس سے فقہا نے جو بنیادی قانون اَخذ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جہاد کا حکم ریاست دے گی۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ دشمن کا تعین کرے کہ کون دشمن ہے اور اُس دشمن کے خلاف جدوجہد کس وقت، کیسے اور کس طریقۂ کار سے کرنی ہے؟

تمام فقہ اور حدیث کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیں۔ دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق امام اور حکمران ہی جہاد اور قتال کی اجازت دیتا ہے۔ پرائیویٹ جہاد اور قتال کا کوئی کنسپٹ اور کوئی تصور دینِ اسلام کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دیکھیے!

جہاد کا تعلق کسی سیاسی نظام کے دفاع کے لیے ہوتا ہے۔ کسی سیاسی نظام کو قائم رکھنے اور کسی دشمن طاقت سے اپنی حکومت کو محفوظ رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ اب جب اسلامی ریاست ہوگی تو اُسے دفاع کی ضرورت ہوگی۔ اگر ریاست ہی اسلامی نہیں ہے، وہاں اسلام نافذ ہی نہیں ہے تو آپ کس ریاست کا دفاع کرنے چلے ہیں؟ غیر اسلامی ریاست کا دفاع کرنے چلے ہیں؟ یا تو آپ اس بات کا اعلان کریں کہ پاکستان اسلامی ریاست نہیں ہے۔ اور یا یہ اعلان کریں کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے۔ اگر اسلامی ریاست ہے تو یہاں آپ کا یہ مطالبہ کہ اسلامی نظام نافذ کرو، یہ بے معنی ہے۔ یہاں کی مذہبی جہادی طاقتیں کہتی ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ تو اگر نافذ ہے تو پھر کس چیز کا مطالبہ ہے؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست غیر اسلامی ہے تو جہاد ہمیشہ ریاست کے مفاد میں ہوتا ہے۔ تو پھر آپ غیر اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے جان لڑانا چاہتے ہیں؟ اس کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟ کہ ریاست اسلامی نہیں ہے۔ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے۔ جنگ یا دفاع یا دفاعی سیکیورٹی فورسز کا تعلق ریاست سے متعلق ہوتا ہے۔ اور ریاست آپ کے خیال کے مطابق غیر اسلامی ہے۔ تو غیر اسلامی ریاست کا دفاع کرنے کو دین کیسے کہا جاسکتا ہے؟

یہ بڑی غلط سوچ لوگوں نے پچھلے چالیس سال سے اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک مخصوص مقصد کے لیے افغانستان میں امریکا کو مطلوبہ نتائج لینے تھے تو یہاں پروپیگنڈا کیا گیا کہ پرائیویٹ جہاد بھی ہوسکتا ہے۔ بغیر ریاست کے بھی ہوسکتا ہے۔ آپ بتلائیں کہ یہ جو کچھ جہاد کے نام پر ہوا ہے، کیا یہاں کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے؟ آج سارے مسلمان مذہبی لیڈر سراج الحق صاحب، قاضی صاحب، فضل الرحمٰن صاحب، نورانی میاں، یہ سب کے سب کہہ رہے ہیں کہ تمھارے کہنے پر ہم نے یہ اسلحہ اُٹھایا تھا۔ تم ہمارے استاد ہو۔ استاد کو پکڑتے نہیں اور شاگرد کو پکڑتے ہو۔ کیوں؟ کون استاد تھا تمھارا؟ اگر یہ پاکستان اُس وقت غیر اسلامی تھا، فوج غیر اسلامی تھی تو اُس غیر اسلامی فوج کے احکامات کیوں مانے؟ اور آج اگر وہی تمھیں دہشت گرد قرار دے رہی ہے تو اپنے کیے کی سزا بھگتنی چاہیے۔

جہاد کا متفقہ قانون جو چودہ سو سال سے پوری اُمت میں موجود رہا ہے، وہ یہ کہ جہاد اور قتال ریاست کا فریضہ ہے۔ ریاست فیصلہ کرے گی۔ پہلے ریاست تو بناؤ۔ حضورؐ نے ریاستِ مدینہ بنائی تو پھر اگلا کام شروع ہوا۔ اپنی ریاست کو اسلامی بنانے کے لیے جو جدوجہد اور کوشش نبی اکرمؐ نے کی، ایک فکر، ایک نظریہ، ایک تعلیم، ایک تربیت، ایک سیاسی معاشی اقدامات، یہ سب کام کیے اور ریاست وجود میں آئی تو پھر اُس کے دفاع اور تحفظ کے لیے نبی اکرمؐ نے اگلا اقدام کیا ہے۔ ریاست بنی نہیں اور کندھے پر لٹھ لے کر نکل پڑے جہاد کرنے کے لیے۔ تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہوگا یا کچھ اَور راستے کا جہاد ہوگا کہ جس کے پھل کسی اور نے کھائے۔ افغانستان میں آپ نے جہاد کیا، نتیجہ امریکا نے نکالا، قبضہ امریکا کا ہوگیا۔ تو آپ کے جہاد کے نتائج اور ثمرات کس نے استعمال کیے؟ امریکا نے۔ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر تشکیل دینے سے پہلے تشدد کا راستہ اور پرائیویٹ اسلحے کا استعمال، ایسا اسلام میں کچھ نہیں ہے۔

سوال: میرا تعلق بلوچستان سے ہے۔ میرا ایک سوال یہ ہے کہ جب ہم ہندوستان کی آزادی کی بات کرتے ہیں تو غیر مسلم کی جو جدوجہد ہے، اُس کو نظرانداز کرتے ہیں۔ اُن لوگوں کو ہیرو مانتے ہیں، جنھوں نے یہاں آ کر اُن کے بندے توڑے اور

مالِ غنیمت کے نام پر مالوں کو لوٹا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مدینہ کی ریاست قائم ہونے کے بعد جنگ کا راستہ کیوں اختیار کیا گیا؟ کیا یہ عدمِ تشدد سے ممکن نہیں تھا؟

جواب: دیکھئے! بڑی بنیادی سی بات ہے۔ آپ کے ایک سوال کا تعلق تو آپ کے تعلیمی نصاب سے ہے۔ آپ کا تعلیمی نصاب جو کچھ آپ کو پڑھاتا ہے، آپ اس کے مطابق پڑھتے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کی آزادی میں دو سو سال تک مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے مل کر آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ دونوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ آپ سب سے بڑی مثال یہاں دیتے ہیں حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس جدوجہدِ آزادی جس میں سیّد صاحب نے جنگ لڑی، آپ کے توپ خانے کا سربراہ ایک غیر مسلم تھا، جو اس جدوجہد میں شریک تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مسلمانوں نے آزادی کے لیے جدوجہد اور کوشش کی تو اُس میں سیّد صاحبؒ نے ایک خط لکھا مہاراجہ گوالیار ہندو راؤ کو کہ آؤ ہم مل کر بیگانگانِ بعید الوطن انگریز سامراج سے آزادی کی جنگ لڑیں۔ اور جب ہم انگریز کو یہاں سے بھگا دیں، پھر ہم مل کر فیصلہ کریں گے کہ ہم نے اپنی ریاست، اپنی یہاں کی اس دھرتی کا نظم ونسق کس طریقے سے اور کن خطوط پر چلانا ہے؟ (38)

یہ بات طے شدہ ہے کہ آزادی کی دو سو سالہ جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم حریت پسند رہے۔ اور غداری میں جیسے مسلمان غدار میر جعفر، میر صادق نے بنگال اور میسور میں، مولوی تراب علی اور حکیم احسن اللہ خان وغیرہ نے دہلی میں غداری کی۔ جیسے ان لوگوں نے غداری کا کردار ادا کیا، ایسے ہی ہندوؤں میں بھی، غیر مسلموں میں بھی بڑے بڑے غدار گزرے ہیں، جنھوں نے یہاں انگریزوں کے لیے غداری کا کردار ادا کیا، جیسے مہاراجہ بنارس' جو ہندو یونیورسٹی بنارس بنانے والا ہے۔ اور سینکڑوں ہندو ایسے فرقہ پرست ہیں، جنھوں نے یہ سارے کام کیے، جو آج راشٹریہ سیوک سنگھ کی صورت میں ہندوستان پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ایسے بہت سارے غدار بھی ہیں۔ تاریخ کو حقائق کے تناظر میں پرکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ جو بیانیہ بن گیا ہے کہ ہر اچھا کام تو مسلمان کے کھاتے میں ڈالنا ہے اور ہر بُرا کام کسی غیر مسلم کے کھاتے میں ڈالنا ہے، ایسا کرنا تاریخ مسخ کرنا ہے۔ جو تاریخی حقائق ہیں، ان کا انکار کرنا ہے۔ یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔

آپ کا دوسرا سوال نبی اکرمؐ کی ریاستِ مدینہ کی تشکیل سے متعلق ہے۔ آپ دیکھئے کہ جب حضورؐ نے ریاستِ مدینہ تشکیل دی تو اُس ریاست کے خلاف کارروائی کرنے والا کون تھا؟ سب سے پہلے مکہ کی سیاسی طاقت' عربوں کی کل قومی طاقت اس لیے جمع کر رہی ہے اور مدینہ پر حملہ کر کے مدینہ کی سیاسی طاقت کو سلب کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسی لیے مکہ پر حملہ کرنے کے بجائے کہاں کا رُخ کیا تھا؟ ابوسفیان کا وہ تجارتی قافلہ جو شام سے آ رہا ہے، اُس کو روکنے کے لیے کہ اس کے ذریعے سے دباؤ بڑھایا جائے، مکہ کی اقتصادی طاقت کو روکا جائے۔ اگر ستر آدمی بدر میں گرفتار کر کے لا سکتے ہیں تو اُس قافلے کے ساتھ بھی تو ستر ہی آدمی تھے، جو ابوسفیان لے کر آ رہے تھے۔ کیا لڑائی لڑنا آپؐ کا مقصد تھا جو مدینہ سے نکلے ہیں؟ آپؐ نے اس تجارتی قافلے کو ہدف بنایا، تاکہ دشمن کی اقتصادی شہ رگ پر ہاتھ رکھا جائے۔ اقتصادی طاقت ہی سیاسی طاقت کو جنم دیتی ہے۔ اور ریاست کی تشکیل کے بعد عدمِ تشدد کا اُصول یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی اقتصادی طاقت کو بغیر جنگ لڑے ہوئے اس طریقے سے ختم کیا جائے کہ اُس کی سیاسی طاقت سر نہ اُٹھا سکے۔

اب جب جیسے ہی مکہ والوں کو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے تجارتی قافلے پر حملہ ہو رہا ہے، اُس کے راستے میں رُکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں، تو وہ اپنے دفاع کے نام پر بدر پہنچتے ہیں۔ اور لڑائی کے ارادے سے مکہ سے نکل کر باہر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ تاریخ پڑھیں تو ابوسفیان کا قافلہ جب بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ حضوؐر کے قافلے کی زد سے نکل گیا تو ابوسفیان نے باقاعدہ ابوجہل کو پیغام بھجوایا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، میں حفاظت سے واپس جا چکا ہوں۔ آپ لوگ واپس مکہ چلے جائیں۔ جب لڑائی کے لیے حضوؐر آ ہی نہیں رہے، آپؐ کا ٹارگٹ ابوسفیان کا قافلہ ہے اور ابوسفیان بھی ابوجہل کو کہہ رہا ہے کہ واپس چلے جاؤ، مگر ابوجہل نے بڑے تکبر سے کہا کہ نہیں! اب ہم جنگ لڑیں گے۔ ان کو اب صفحۂ ہستی سے مٹائیں گے۔ بڑے رجزیہ شعر پڑھے، سارے لوگوں کو جمع کیے رکھا۔ لڑائی کے لیے تیار کیا۔ جنگ کے اقدامات کے لیے تیاری کرنے والا کون ہے؟ مکہ کا لشکر ہے۔

آپ بتاؤ کہ جب دشمن آپ کی ریاست کے درپے ہو، آپ کی اجتماعی طاقت کو فنا کرنے کے درپے ہو تو پھر مقابلہ کرنا ہے یا نہیں؟ وہاں بزدلی ہے کہ آپ کہیں کہ تم لڑنا چاہتے ہو، ہم تو عدمِ تشدد کی بنیاد پر نہیں لڑتے، ہم بھاگ کر واپس مدینہ جاتے ہیں۔ اس کا مطلب سوائے دشمن کو اپنے گھر بلانے کے اور کیا ہے؟ حضوؐر نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔ اب غیرت کا معاملہ ہے۔ اب اجتماعیت کا معاملہ ہے۔ اب یہاں سے پیچھے ہٹنا درست نہیں۔ اس لیے صحابہؓ سے پوچھا کہ دیکھو! اس وقت ہمارا ہدف تھا وہ قافلہ، وہ قافلہ تو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ تم بتاؤ اگر لڑنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں لڑنا چاہتے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ سب نے کہا کہ نہیں! جب دشمن ہم سے لڑنا چاہتا ہے، اس وقت واپسی کا قدم اٹھانا تو شکست تسلیم کرنا ہے۔ اپنی موت پر دستخط کرنا ہے۔ وہ ٹرننگ پوائنٹ آ گیا کہ جہاں اب لڑائی کرنا ضروری ہے۔ اللہ نے بھی فرما دیا کہ اب کفر کی جڑ کاٹنا ضروری ہے۔

یہ نبی اکرمؐ کی سیرت کا پورا پس منظر ہے۔ بات وہی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو دین علمی طور پر سمجھنا چاہیے۔ سیرت کو علمی نقطہ نظر سے سمجھنے کے لیے سوالات کرنے چاہئیں، گفتگو کرنی چاہیے۔ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کھلے دل سے جو چاہیں سوال کریں، علمی بنیادوں پر دینی اُمور اور افکار کو سمجھیں۔ دین کو جب تک ہم علم و فکر کی بنیاد پر سائنٹفک طریقے سے نہیں سمجھیں گے تو ہمارے سوالات حل نہیں ہوں گے۔ اِدھر اُدھر سے سنی سنائی باتیں، آدھی ناقص قسم کی باتیں ہم تک پہنچتی ہیں اور اُس کی بنیاد پر دین کے بارے میں ہم اپنے ذہن میں ایک تصور قائم کر لیتے ہیں۔ پھر اُس پر اپنی پوری عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ یہ درست بات نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر جو علمی اور سائنٹفک انداز میں امراض کو سمجھتا ہے اور ایک بے چارہ کمپوڈر / ڈسپنسر یا اس کے ساتھ دو چار دوائیوں کے نام یاد رکھنے والا کام کرتا ہے، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہمیں علمی طور پر دین پر شعور اور کمانڈ حاصل کرنی ہے، تاکہ ہمارے کنسپٹ کلیئر ہوں۔ ادارہ رحیمیہ یہی مواقع فراہم کرتا ہے۔ آپ نوجوان ہیں، وقت لگائیں، جدوجہد اور کوشش کریں۔ ہمارے وہ دوست جن کی دعوت سے آپ یہاں آئے ہیں، اُن کے ساتھ ملیں تو ضرور آپ کے تمام سوالات کے جوابات اس فورم سے دیے جائیں گے۔

سوال: میں زوالوجی ڈیپارٹمنٹ سے ہوں۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے اور آپ نے بھی بتایا کہ ظلم انسانیت کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیر، برما، فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم کی انتہا ہو رہی ہے، اور اقوامِ عالم کے ساتھ

ساتھ اس دنیا میں جتنے بھی مسلمان ہیں، وہ بھی اس کو روکنے کے حوالے سے اہتمام نہیں کر رہے۔ تو اس حوالے سے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: دعا کرنی چاہیے۔ کیوں کہ 'ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'! آپ ستاون مسلمان ممالک ہیں، لیکن اقتصادی اعتبار سے، سیاسی اعتبار سے، معاشی قوت کے حوالے سے آپ کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ اب جب یہ کشمیر کا مسئلہ اُٹھا اور یہاں ہمارے بھڑکیلے لیڈروں نے کہا کہ ہمیں کشمیر فتح کرنے کے لیے میدان میں اُترنا ہے تو لوگوں نے آئینہ دکھایا کہ آپ تو آئی ایم ایف سے قرضوں کی بھیک مانگ مانگ کر اپنا ملک چلا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے سات ارب کے ریزور ہیں۔ انڈیا کے پاس چار سو ارب روپے کے ریزرو ہیں۔ معاشی طاقت تو وہ ہے۔ آپ کا ساتھ تو سعودی عرب نے بھی نہیں دیا۔ وہ تو مودی کو ایوارڈ دے رہا ہے۔ آپ کا ساتھ تو کویت، قطر اور متحدہ عرب امارات نے نہیں دیا۔ جب انسانی مسائل کے حل کرنے کے لیے آپ کوئی کردار ادا کریں گے اور سب سے پہلے اپنے ملک کی، اپنی اجتماعی طاقت کی، اپنی قوت کو مضبوط بنانے کی حکمتِ عملی اپنائیں گے تو کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ دنیا میں کسی مسلمان معاشرے پر کسی طرح کا ظلم کرے۔

ظلم کو کسی فرقے کے تناظر میں دیکھنا درست بات نہیں۔ مظلوم مظلوم ہے۔ آپ نے حدیث سنی ہوگی کہ مظلوم اگر چہ غیر مسلم اور مشرک بھی ہو، اُس کی پکار عرش تک پہنچتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جو ہم نے اپنے لیے ماحول پیدا کر دیا ہے بھیک مانگنے کا، یہاں کے لیڈروں نے ملک اور قوم کی دولت لوٹ لوٹ کر دوسرے ملکوں میں پہنچانے کا، قرضوں کی شراب پینے کا، تو اس کے نتیجے میں جو کچھ کمزوری ہمارے قومی وجود کو لاحق ہے، وہ ہمیں اقدام کرنے سے روکتی ہے۔ اپنی طاقت پیدا کرنا یہ سب سے پہلی بات ہے۔ اللہ نے بھی حکم دیا: اَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ [39] پہلے طاقت پیدا کرو اور طاقت ایک بہتر فکر، اعلیٰ جدوجہد، اجتماعیت، نظم وضبط اور درست مینجمنٹ سے آتی ہے۔ بے شعوری، غفلت اور انسانیت کے لیے منفی کردار ادا کرنے کے نتیجے میں طاقت سلب ہوتی ہے۔

سوال: میرا تعلق گیلانی لاء کالج سے ہے۔ ہم لوگ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام لیتے ہیں۔ مدینہ کی ریاست کی طرف گامزن ہیں۔ انگریز کے دیے ہوئے نظام کو ترک کر کے اسلامی نظامِ عدل کو نافذ کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان کو، اس ریاست کو کیا اقدام کرنے چاہئیں؟

جواب: اپنے فکر اور سوچ میں یک سو ہونا ضروری ہے۔ دینی حوالے سے سیاسی شعور اور معاشی و اقتصادی معاملات کا شعور حاصل کرنا ضروری ہے۔ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونا اور نوجوانوں میں معاشی ترقی کے لیے تخلیقی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جب تک اجتماعی طور پر ہمارے اندر یہ تمام پہلو نہیں ہوتے تو کوئی ریاست محض باتوں سے نہیں بن جاتی۔ ہم نے ستر سال سے اپنے آئین میں لکھ دیا کہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' تو کیا اسلامی جمہوریہ لفظ لکھنے سے ایسا ہو جائے گا؟ ہمارے آج کے حکمران ''ریاستِ مدینہ'' کا نعرہ لگائیں، جب کہ وہ ''ریاستِ مکہ'' توڑنا نہ چاہیں۔ حضورؐ نے ریاستِ مدینہ بنائی تھی ریاستِ مکہ توڑ کر۔ ہم انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام کو توڑنا نہ چاہیں اور آزادی اور حریت کی بنیاد پر اپنا عدالتی، سیاسی، معاشی نظام تشکیل نہ دیں تو ریاستِ مدینہ کیسے بنے گی؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ پرانے فرسودہ نظام کو ختم کیا جائے۔

آپ دیکھئے کہ مسلمانوں کا نظام دنیا میں ایک ہزار سال تک رہا ہے۔ آج یہ کیپٹل اِزم جس کی بنیاد پر نظام بنایا گیا، بڑی مشکل سے اس کی دوسوا دوسو سال عمر ہے۔ اور سوشلزم کی عمر ایک سو سال بھی نہیں ہے۔ 1917ء میں انقلابِ روس آیا۔ آج سو سال ہوگئے۔ تو جس نظام نے ایک ہزار سال تک تمام انسانوں کو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب انسانی مسائل کے حل کرنے کا راستہ ہموار کیا، اس کو سیکھنے میں دِقت کیا ہے؟ جب تک ہم دین کو اس طرح سیکھیں گے نہیں، اس کو عملی طور پر سمجھیں گے نہیں تو نتیجہ کیسے پیدا ہوگا؟

سوال: میرا تعلق وزیرستان سے ہے۔ آپ نے ظلم کے بارے میں بہت باتیں کیں۔ میں اس کے بارے میں آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں ہمارے وزیرستان میں جو ظلم ہو رہا ہے، اس پر آپ بات نہیں کر رہے۔ لیکن جو ملتان یا پنجاب میں ہو رہا ہے، اس پر آپ بات کرتے ہیں، لیکن وزیرستان کے ظلم پر آپ بالکل بات نہیں کرتے۔ وجہ کیا ہے؟ کیا آپ ڈرتے ہیں کسی سے؟ دوسری بات یہ ہے کہ وزیرستان میں چیک پوسٹوں پر لوگ جاتے ہیں۔ ریڈ مائنز ہیں۔ ریڈ مائنز کا مسئلہ یہ ہے کہ جو ہمارے مخالف ہیں، جس نے حفاظت کے لیے یہاں پر نصب کیے ہیں۔ تیسرا جو اہم مسئلہ ہے، وہ یہ کہ نامعلوم افراد آتے ہیں اور لوگوں کو اُن کے گھروں میں اُن کے بچوں کے سامنے مارتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ آپ اس پر بات کیوں نہیں کرتے؟

جواب: ہم تو ہر ظلم کے خلاف بات کرتے ہیں۔ کوئی بھی کہیں بھی کسی جگہ پر بھی ظلم ہو رہا ہو۔ اب آپ دیکھئے کہ آپ کے وزیرستان کو فاٹا سے نکال کر ملک کے بندوبستی علاقے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ابھی آپ کے صوبہ خیبر پختونخوا کے ساتھ پورے فاٹا کی تمام ایجنسیز شامل کردیں۔ وہاں تھانہ، پولیس، تحصیل سب کچھ قائم ہوگیا۔ اب آپ بتلایئے کہ ہم اس پورے نظام پر بات کر رہے ہیں کہ جو ہمارے ملک کا پولیس سسٹم ہے، ہمارے ملک کا عدالتی نظام ہے، ہمارے ملک کا سیاسی اور معاشی سسٹم ہے، یہ انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا ہے۔ اس وقت انسانی حقوق کے ادا کرنے کے لیے اس میں جان نہیں رہی۔ یہاں جو مفاد پرست طبقہ ہے، وہ اس سسٹم سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ انسانی مسائل حل نہیں کر رہا۔

اب آپ بتایئے کہ یہ سسٹم اگر فاٹا میں بھی ہے اور یہی سسٹم ملتان میں بھی ہے، یہی سسٹم لاہور اور کراچی اور کوئٹہ میں بھی ہے اور پورے سسٹم میں جو ناکارگی اور فرسودگی ہے کہ انسانی مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے تو اس میں فاٹا شامل ہوگیا کہ نہیں؟ یہ ظلم تو بالکل ظلم ہے کہ جو آپ بتا رہے ہیں کہ زیادتی ہے۔ کیا دن دیہاڑے یہاں بندے نہیں اٹھائے جا رہے؟ ہر جگہ اٹھائے جا رہے ہیں۔ تو اجتماعی نقطہ نظر سے آپ سوچیں۔ جب ایک خاص خطے کی بات کریں گے تو وہیں کوئی نہ کوئی لسانی جھگڑا ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ لسانی مسئلہ ہے۔ کبھی کہیں گے نسلی جھگڑا ہے۔ کبھی کہیں گے کہ کوئی اَور چیز فرقہ واریت کے تناظر میں ہے۔ طالبِ علم کا کام ہے کہ وہ علمی طور پر سسٹم کا جو اجتماعی تقاضا اور دائرہ ہے، اُسے سمجھے اور اس کے تناظر میں حکمتِ عملی اپنائے۔ وہ چاہے فاٹا ہو، خواہ کوئی ایجنسی ہو، خیبر پختونخوا ہو، بلوچستان ہو، سندھ ہو، پنجاب ہو، یہ سب ہماری دھرتی ہے۔ ہماری قوم کی شناخت ہے۔ پاکستان کی وحدت کا حصہ ہے۔ اُس کی اجتماعیت میں استحکام تبھی آئے گا کہ جب ہم ٹھنڈے دل کے ساتھ مظالم ڈھانے والے سسٹم کو پکڑیں گے۔ مزعومہ افراد، شخصیات اور اداروں کے پیچھے جائیں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس سے سوائے افتراق و انتشار

پیدا ہونے کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اجتماعی طور پر مسائل کو سمجھ جائیں، یہی علم کہلاتا ہے۔ اور اسی علم کے حصول کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ اس شعور کو پیدا کریں گے تو درست نتیجہ نکلے گا۔

سوال: میں انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز کا سٹوڈنٹ ہوں۔ آپ نے جہاد کی بات کی۔ افغانستان کے جہاد کے بعد کیا علمائے کرام کو یہ علم نہیں تھا کہ کیا بات صحیح اور کیا غلط ہے؟ وہ فوج کے دباؤ میں کیوں جہاد پر گئے؟ اور اگر پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، یہاں ایک منظّم فوجی ادارہ ہے تو پھر جہادی تنظیموں کی کیا ضرورت ہے؟

دوسرا سوال میرا یہ ہے کہ بعض علمائے کرام فرقہ واریت کو فروغ کیوں دیتے ہیں؟ اگر ہم ایک ہی مسئلہ ایک ہی کے فرقے کے دو علمائے کرام سے پوچھ لیں تو 100% وہ متضاد جوابات دیتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے قرضے کی بات کی۔ پاکستان پر اربوں کھربوں کا قرضہ ہے۔ کیا اس قرضے کی ذمہ داری صرف حکمرانوں پر ہے؟ قرضے میں کوئی سبسڈی ملتی ہے تو ہم عوام تک پہنچتی ہے۔ پیٹرول 65 روپے ملا، ہم نے ڈلوایا، نواز شریف یا عمران خان نے نہیں۔ تو ہم حکمرانوں کو کیوں کہتے ہیں کہ قرضہ انھوں نے لیا اور کھایا۔ ہم اپنے آپ پر بلیم کیوں نہیں کرتے؟

جواب: یہ دو سوال جو آپ نے پہلے کیے ہیں جب آپ کا جہاد شروع ہوا تھا، ہم نے بھی یہ سوال کیے تھے کہ آپ کو کیا فائدہ ہے؟ ہمارے جو بزرگ مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ تھے، انھوں نے اس زمانے میں یہی سوال پوچھا تھا کہ جب جہاد کا تعلق ریاست سے ہے، تو یہ پرائیویٹ جہاد کیوں شروع کر دیا؟ اور اس جہاد کے نتیجے میں جو کچھ ہوگا، حضرتؒ نے اُسی وقت فرمایا تھا کہ ہمارے یہ مدارس، یہ مساجد اور سارا دینی کام جتنا بھی ہے، یہ متأثر ہوگا۔ بلکہ اس جہاد کی آڑ میں جو آج فوج چلا رہی ہے، اس میں خود فوج کے پاؤں بھی جلیں گے۔ اور اس وقت یہ اس کو دہشت گردی قرار دے کر اس کے خلاف کام کرے گی۔ یہ سوالات تو ہر صاحبِ عقل و شعور نے اُس زمانے میں کیے۔ لیکن آپ کو پتہ ہے کہ جیسے یہاں ہر شعبے میں لوگ مل جاتے ہیں، ایسے ہی اس شعبے میں باقی لوگ بھی اس کے لیے استعمال ہوئے۔ تو دیکھنا اور سوچنا یہ ہے کہ یہ سوالات اٹھائیں۔ ان پر غور و فکر کریں۔ ان کے جوابات دیکھیں۔ جماعتوں کا جائزہ لیں کہ کون سی جماعت ہے، جس نے ان سوالات کو سامنے رکھ کر مؤقف اپنایا تھا اور کون سی جماعت ہے، جس نے ان سوالات کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ کیا تھا۔

جہاں تک آپ کے تیسرے سوال کا تعلق ہے تو آپ یہ دیکھیے کہ آپ کو پیٹرول پر کون سی سبسڈی مل رہی ہے، جس میں آپ اُس کا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ آپ تو پیٹرول کی اصل قیمت پر 65 روپے زائد دے رہے ہیں۔ ٹیکس کی صورت میں دے رہے ہیں۔ پھر فیصلہ کرنے کا اختیار حکمرانوں کا ہے، یا عوام کا ہے؟ آج دنیا میں جو بہادر اقوام ہیں، ان پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں، لیکن اُن کی ریاست نے، اُن کے عوام نے اُن پابندیوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی اجتماعیت کے لیے ایک شناخت پیدا کی ہے۔ آپ کے ہاں صورتِ حال کیا ہے کہ مصنوعی طور پر ذرا سا معاشی مسئلہ پیدا کیا جاتا ہے اور قرضوں کی بارش آپ کے ملک پر ہو جاتی ہے۔ اس کے فیصلے کون کرتا ہے؟ جب ہم سسٹم کے طور پر اجتماعیت کو دیکھیں گے تو اجتماعیت کی اتھارٹی کس کے پاس ہے؟ مینجمنٹ کس کے پاس ہے؟ حکومت کس کے پاس ہے؟ قرضے وہ لیں اور قرضے یہاں سے لے کر دوسرے ملکوں میں منتقل

کردیں، جرم تو ہمارے حکمران کرتے ہیں۔ ہماری نااہل قیادت کا جرم ہے۔اُس عام انسان کا،غریب، ہاری اور کاشت کار کا کیا جرم ہے، جو ایک لیٹر پیٹرول ڈلواتا ہے اور اُس پر 65 روپے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ ملک اور قوم پر بوجھ پڑتا ہے۔قرضوں کی پوری معیشت آپ کی پوری سوسائٹی پر، تمام لوگوں پر گرفت رکھے ہوئے ہے۔ یہ حکمران طبقے کا کردار ہے۔اس کے علاوہ اَور کیا ہے؟

سوال: میرا تعلق فوڈ سائنس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آپ بات کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی دوسرے ممالک میں کوئی عزت نہیں ہے، وقار نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ مسلمان تعداد میں تو زیادہ ہیں، دوسری اقوام سے، جیسے اسرائیل ہے، دوسرے ممالک ہیں، لیکن جو مسلمانوں کے قابل بندے ہیں، اُن کی کمی ہے۔کوالٹی آف لیڈر کی کمی ہے۔آج اس نشست میں علمائے کرام کی طرف سے عوام کو شعور دیا جائے کہ آپ تعداد کو نہ لیں، لیکن افراد کی جو شخصیت ہے، یا اُس کی جو خصوصیات اپنائی جائیں تو قابل انسان پیدا ہوں گے۔ سائنٹسٹ پیدا ہوں گے۔ انجینئرز پیدا ہوں گے۔تو اس سے ملک میں اسلام ترقی کرے گا۔

جواب: جہاں تک علما کی ذمہ داری کی بات ہے تو سب سے پہلے آپ اُن علما میں تمام اہلِ علم شامل ہیں، جو انجینئر علما، ڈاکٹر علما، سیاست دان علما، مذہبی علما، قرآن کے علما، سارے علما شامل کرلیں۔ یعنی یہ علما کا لفظ صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے آپ مخصوص کریں یا علما اپنے لیے مخصوص کریں تو یہ درست بات نہیں ہے۔علم تو ہر شعبے کا ہمیں حاصل کرنا ہے۔ ہم سب علما اہل علم ہیں اور اس میں تمام شعبوں کے طالبِ علم بھی شامل ہیں۔ کیوں کہ طالبِ علم بھی تو مستقبل کے علما ہیں۔ وہ انجینئر ہوں گے، ڈاکٹر بنیں گے، پروفیسر بنیں گے، قرآن کے عالم بنیں گے، تو جتنے بھی اہلِ علم ہیں، ہم سب اجتماعی طور پر حلف اٹھائیں کہ ہم اپنے علم کے ذریعے سے اپنے اندر کوالٹی پیدا کریں گے۔ محض تعداد پر زور نہیں دیں گے، اپنی اجتماعیت کو قائم کریں گے اور اپنے علم سے اپنے ملک اور قوم کو اور اپنی اجتماعیت کو فائدہ پہنچائیں گے۔ تو ضرور ہمارے اندر تبدیلی پیدا ہوگی اور یقیناً اس کے لیے ہم جدوجہد اور کوشش کر کے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں گے۔

----

www.rahimia.org

صدارتی کلمات

حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مدظلہٗ
سابق چیئرمین موسیٰ پاک چیئر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم، أمّا بعد!

سب سے پہلے تو میں یونیورسٹی کی طرف سے شکریہ ادا کروں گا آج کے محترم مہمانِ خصوصی کا۔ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے بڑی تفصیل کے ساتھ آپ سے مکالمہ کیا۔ آپ نے ایک بہت بڑا فرق محسوس کیا ہوگا کہ عام طور پر ہمارے ہاں گفتگو یک طرفہ ہوتی ہے کہ اسٹیج پر لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، وہ سنانا چاہتے ہیں، وہ سننا نہیں چاہتے۔ لیکن آج کی اس نشست کی یہ خوبی رہی کہ دوطرفہ مکالمہ ہوا، گفتگو ہوئی۔ اصل میں تعلیم کی یہی روح ہے جو آج ہماری کلاس روم میں نہیں ہے۔

میں خود چوں کہ یونیورسٹی میں ایک طویل عرصہ رہا ہوں، یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارا استاد کلاس میں سوال کو پسند نہیں کرتا۔ اور سوال کرنے والا مستقل طور پر اُس کا ہدف بن جاتا ہے۔ حال آں کہ جب سوال کو آپ ڈِسکریج کریں گے، روکیں گے تو پھر سوچ ترقی نہیں کرتی۔ سوچیں اُسی وقت پھلتی پھولتی ہیں کہ سوالات پیدا ہوں، اُن کا حل تلاش کیا جائے۔ اسی طرح ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اسی سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کا طریقۂ کار کیا ہے؟ وہ کس طرح چیزوں کو پیش کرنا چاہتا ہے؟ اس کی کوئی روایتی یا رسمی تعلیم نہیں ہے کہ مخصوص قسم کے کلاس روم کے اندر، مخصوص اوقات کے اندر کچھ چیزیں پڑھائی ہوں اور اس کے بعد کوئی ڈگری دینی ہو۔ یہ ڈگری دینے والا انسٹیٹیوشن نہیں ہے۔ یہ سوچ کو بڑھانے والا ہے کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں کوئی بھی شخص ہو، وہ سوچنے کی طرف آئے، سوال کی طرف آئے، سوال کے جواب کی تلاش میں جائے۔ اگر ہمارا نوجوان اس طرف آجائے کہ اُس نے ہر بات پر غور کرنا ہے، سوچنا ہے، سوال قائم کرنا ہے، سوال کا جواب حاصل کرنا ہے، اُس کی روشنی میں اپنے علم کو آگے بڑھانا ہے تو آپ کی تعلیم کا جو حقیقی مقصد ہے، وہ آپ کو حاصل ہوسکتا ہے۔

آج جس کی طرف لیکچر میں بار بار توجہ دلائی گئی، وہ یہی ہے کہ ہمارے اندر اجتماعیت موجود نہیں ہے۔ یہ جتنے بھی آپ سوالات کر رہے ہیں، اُس کے پیچھے یہی وجہ ہے کہ آپ فرقہ واریت کی شکایت کرتے ہیں، کبھی آپ حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس چیز کو بتاتی ہیں کہ سوسائٹی بکھری ہوئی ہے۔ پاکستان نام کا ایک جغرافیہ تو ہے، لیکن پاکستان کے اندر وحدتِ فکری نہیں ہے۔ کسی بھی فورم پر آپ چلے جائیں۔ پچھلے دنوں آپ نے رپورٹ پڑھی ہوگی الیکشن کمیشن میں سو سے زیادہ سیاسی

جماعتیں رجسٹرڈ ہیں۔ اور جو سرگرم جماعتیں ہیں، اُن کا بھی آپ نے کردار دیکھ لیا ہے۔ اُن کا نقطہ نظر بھی آپ کے سامنے موجود ہے۔ یعنی کوئی بھی کسی بھی زندگی کے شعبے میں اپنے کاز کے ساتھ مخلص نہیں رہا۔ اور سب کے سب اس ایک نکتے پر متفق ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دھوکا دیا جائے۔ تو یہ دھوکے کی سیاست ہماری سوسائٹی کے اندر ہے۔ دھوکے کی معیشت ہماری سوسائٹی میں ہے۔ دھوکے کا مذہب ہماری سوسائٹی میں ہے۔ دھوکے کے اَخلاق ہماری سوسائٹی میں ہیں۔ اس چیز کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہمارے اندر سوچنے کا، سمجھنے کا، چیزوں کو صحیح طور پر پرکھنے کا ایک عمل شروع ہوگا تو وہ ہمارا حقیقی آغاز ہوگا۔ وہیں سے پھر ہم آگے بڑھ سکیں گے۔ پھر اُس کے بعد سوچیں گے کہ ہم نے مسائل کو کس طرح حل کرنا ہے۔

پھر دوسری بات جو ان سوالات سے بار بار ظاہر ہوئی کہ کسی اور سے آپ توقع رکھ رہے ہیں کہ وہ کیوں نہیں کرتا؟ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو بھاڑ میں جائے جو بھی ہے، آپ نے کام کرنا ہے۔ ہم یہ سوچیں کہ یہ پاکستان ہمارا ہے۔ ہم نے اس میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ ان لوگوں سے ہم نے کیا توقعات رکھنی ہیں کہ جنھوں نے پاکستان کو 72 سال سے لوٹا ہوا ہے اور لوٹ رہے ہیں۔ جو پاکستان کے اندر حکمران اپنے علاج کے لیے بھی کوئی ہسپتال نہیں بنا سکے۔ اسی سے آپ اندازہ کرلیں کہ عام آدمی کے لیے اُن کے کیا جذبات ہوں گے؟ اس لیے ان میں سے کسی سے کوئی توقع نہیں رکھنی۔ پھر تو آپ آگے بڑھیں گے۔ ہر پانچ سال کے بعد کوئی ڈگڈگی بجانے والا آجاتا ہے۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ چلو اس کو آزما لیتے ہیں۔ پھر اگر کوئی پانچ دس سال منظر سے ہٹ جاتا ہے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ اب شاید یہ سُدھر گیا ہوگا۔ اب پھر اس کو آزما لیتے ہیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس مخمصے سے نکلنا ہے۔

آج کی نشست کا جو بنیادی فوکس تھا، وہ اسی چیز کو اُبھارنا تھا کہ آپ چیزوں کو سمجھنے کی طرف جائیں، اپنی تعلیم کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں، اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں، خطے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دنیا کہاں پہنچ گئی، اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ملکوں کے ساتھ اپنا موازنہ کریں۔ اب ہم ہندوستان کے ساتھ دشمنی میں تو موازنہ کر رہے ہیں، لیکن کبھی یہ بھی موازنہ کرکے دیکھ لیں کہ ہم دونوں اکٹھے ہی آزاد ہوئے تھے، وہ کہاں پہنچ گئے اور ہم کہاں پر کھڑے ہیں۔ یہ بھی تو موازنہ کرنے کی چیز ہے۔ ترقی میں وہ کہاں چلا گیا؟ کن کن چیزوں میں وہ پیچھے چلا گیا؟ کن چیزوں میں ہم اُس کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟ کن میں نہیں کرسکتے؟ چائنہ جو آپ سے دو سال کے بعد آزاد ہوا، آج آپ کا اُس سے کوئی مقابلہ بنتا ہی نہیں ہے۔ اب آپ اُس سے مانگنے والے ہیں۔ یہ سارے حقائق ہیں گردوپیش میں، جن کو آپ نے اپنی اپنی فیلڈ میں رہ کر سوچنا ہے۔

یہ بلیم گیم سے نکلنا ہوگا کہ وہ نہیں کرتا، یہ نہیں کرتا، وہ کچھ نہیں کریں گے۔ ان سے آپ کوئی توقع نہ رکھیں۔ نہ اُن لوگوں سے جو سیاست میں ہیں، نہ اُن لوگوں سے جو مذہب کے نام سے کام کر رہے ہیں، جو فرقہ پرستی کے نام سے کام کر رہے ہیں، جو نسل پرستی کے نام سے کام کر رہے ہیں، جو زبانوں کے حوالے سے جھگڑے پیدا کر رہے ہیں۔ یہ سب کے سب ایک ہی گروپ ہیں۔ اس کے بہت سارے چہرے ہیں۔ اس لیے ان چہروں کو پہچاننا ہے۔ یہ پہچان جب نوجوان میں پیدا ہوجائے گی تو وہ اپنی صلاحیتوں کو خود تلاش کرے گا۔

ادارہ رحیمیہ کا بنیادی پیغام ہی یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں کو تلاش کریں۔ آپ میں صلاحیتیں ہیں۔ ہم کیوں ان لوگوں کے

پیچھے جاتے ہیں، جن کے اندر کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ آپ اپنے وزرا کا ہی جائزہ لیں، جو اس وقت منظرِ عام پر ہیں۔ نہ ان میں بات کرنے کی صلاحیت ہے، نہ ان کو اپنے شعبے کا کچھ پتہ ہے۔ یعنی کوئی کمال ان کے اندر ہمیں نظر نہیں آتا کہ کس وجہ سے لوگوں نے ان کو منتخب کیا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ ہم بجائے توقعات باندھنے کے، بجائے مرثیہ پڑھنے کے، بجائے نوحہ پڑھنے کے، یا دُم دبا کر ملک سے بھاگنے کے، یہاں رہ کر حل تلاش کریں۔ ہم نے یہیں رہنا ہے۔ یہ ہماری دھرتی ہے، یہیں پر ہمارے بڑے مدفون ہیں، ہم نے بھی یہیں رہنا ہے۔ اگلی نسلوں نے بھی یہیں رہنا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اپنے مسائل کو سمجھنا ہے، ادراک حاصل کرنا ہے، حق کو تلاش کرنا ہے اور اس سفر کو ہم نے مزید آگے بڑھانا ہے۔ یہ علم کا سفر ہے، یہ شعور کا سفر ہے، یہ ادراک کا سفر ہے، اس سفر کو ہم نے مزید آگے لے کر چلنا ہے۔ تو یقیناً ہمارا یہ سوچنے کا عمل آگے بڑھے گا۔

پھر ایک بات ذہن میں رکھیں کہ یہ جتنی بھی ہم گفتگو کر رہے ہیں، ہماری نہ کسی پارٹی سے کوئی لڑائی ہے، نہ ہماری کسی حکومت سے لڑائی ہے، ہماری اصل ضرورت سسٹم کو سمجھنے کی ہے۔ یہ پارٹیاں تو اُس کے لیے کام کرتی ہیں، کبھی ایک پارٹی تو کبھی دوسری پارٹی۔ کبھی ایک اپوزیشن میں جاتی ہے، کبھی دوسری اپوزیشن میں آجاتی ہے۔ پارٹیوں سے ہمارا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پارٹیوں کے اندر موجود نوجوان بھی ہمارے ہی نوجوان ہیں۔ ہمیں ان سے بہت ہمدردی ہے کہ وہ کس طرح کے نااہل اور ناکارہ لوگوں کے پیچھے لگے ہیں اور کس طرح انھیں استعمال کیا جارہا ہے، لیکن موجودہ سسٹم کسی بھی صورت میں اس قابل نہیں ہے کہ اس کو مزید قبول کیا جائے۔ اسی سسٹم نے آپ کے پاکستان کے دو حصے کیے ہیں۔ اسی سسٹم نے آج صوبوں کو آپس میں لڑا رکھا ہے۔ ایک صوبے کے اندر لڑائیاں پیدا کی ہوئی ہیں، لیکن یہ خود سسٹم چلانے والے اور بیوروکریٹ ہی کو دیکھیں۔ بیوروکریسی کے اندر پنجابی بھی بیٹھا ہوا ہے، پختون بھی بیٹھا ہوا ہے، سندھی بھی بیٹھا ہوا ہے، کوئی ایک آدھ بلوچ بھی بیٹھا ہوگا، یہ سب پوری ایک باڈی ہے۔ یہ ایک جماعت ہے۔ اُن کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی۔ اس میں شیعہ بھی بیٹھا ہوا ہے، سنی بھی بیٹھا ہوا ہے، لیکن تفریق نیچے ہے۔ وہ نیچے کے لوگوں کو لڑاتا ہے۔ ''ڈیوائڈ اینڈ رُول'' کی پالیسی چلتی ہے۔ ہمیں اس کو سمجھنا ہے۔ ہمیں آپس میں اُلجھنے کے بجائے، آپس میں لڑنے کے بجائے، ایک دوسرے پر الزامات دھرنے کے بجائے ہمیں اپنے علم کو بڑھانا ہے۔ اپنے شعور میں اضافہ کرنا ہے۔

اس طرح کی یہ علمی نشستیں انشاءاللہ جاری رہیں گی۔ اور مستقبل میں بھی ہم حضرت رائے پوری سے درخواست کریں گے کہ وہ ملتان کے لیے خصوصی وقت دیں، تاکہ آپ حضرات کے ساتھ زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ نشستیں ہو سکیں اور اس طرح ہم اپنے علم و شعور میں اضافہ کر سکیں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔

حوالہ جات

1۔ الفاتحہ: 6-5۔

2۔ الاحزاب: 21۔

3۔ الانبیاء: 107۔

4۔ **صحیح بخاری. باب ما ذکر عن بنی إسرائیل.** حدیث 3455، طبع بیروت

5۔ **صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب 53، حدیث نمبر 4950**

6۔ **السّیرة النّبویّة لابن کثیرؒ، جزء أوّل، ص: 259، طبع: مکتبة دار المعرفة للطّباعة و النّشر و التّوزیع، بیروت.**

7۔ العلق: 1۔

8۔ صحیح بخاری، حدیث: 3۔

9۔ العلق: 5۔

10۔ العلق: 5۔

11۔ العلق: 6۔

12۔ القصص: 4۔

13۔ ایضاً۔

14۔ البقرہ: 205۔

15۔ النازعات: 17

16۔ العلق: 15۔

17۔ العلق: 16۔

18۔ العلق: 17۔

19۔ العلق: 18۔

20۔ العلق: 19۔

21. **قال رسول اللّٰه ﷺ: "یا عمّ! و اللّٰه! لو وضعوا الشّمس فی یمینی، و القمر فی یساری علیٰ أن أترک هٰذا الأمر، حتّی یظهره اللّٰه أو أهلک فیه ما ترکته".** (اے چچا جان! اللہ کی قسم! اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اس شرط پر کہ میں اس دین کو چھوڑ دوں، ایسا نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ اللہ اسے غالب کردے یا میں اس میں ہلاک ہوجاؤں، میں اسے بالکل نہیں چھوڑوں گا۔) **(السّیرة النّبویّة لابن هشّام، مباداة رسول اللّٰه قومه و ما کان منهم، الجزء الأوّل، ص: 299)**

22۔ الحج: 39۔

23۔ **السّیرة النّبویّة لابن کثیرؒ، الجزء ثانی، ص: 322.**

24۔ النساء: آیات 60 تا 70۔

25۔ صحیح بخاری، حدیث: 1739۔

26۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا: ''رأیت عمرو بن لُحیی بن قمعة ابن خندف یجرّ قصبه فی النّار ..... انّه اول من کان غیّر دین اسماعیل فنصب الاوثان، و بحر البحیرة، و سیّب السّائبة، و وصل الوصیلة، و حمیٰ الحامی''. (سیرت ابن هشام، ج: 2، ص: 94، طبع: دارالکتاب العربی، بیروت)

27۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے پینڈرل مون کی کتاب "Strangers In India"، اردو ترجمہ: ''ہند میں انگریز ریاست''، تیسرا باب: کسان اور قانون، ص: 37 تا 51، طبع: تخلیقات، لاہور

28۔ پھر اس مقدمے کا فیصلہ جنوری 2018ء میں سو سال کے بعد ہوا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے بی بی سی کی رپورٹ مؤرخہ 30/ جنوری 2018ء۔

29۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے:

The Corporation that Changed the World How the East India Company Shaped the Modern Multinational by Nick Robins.

30۔ چیف جسٹس پاکستان آصف سعید کھوسہ نے کہا کہ: ''اگر مجھے نظر بھی آرہا ہے کہ اس نے قتل کیا، جب بھی قانون سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ ہمارا کام انصاف کرنا نہیں، بلکہ قانون کے مطابق انصاف کرنا ہے''۔ (شہ سُرخی، روزنامہ جنگ، 24/ نومبر 2019ء)

31۔ روزنامہ ایکسپریس لاہور، 4/ نومبر 2015ء، ص: 1۔

32۔ صحیح بخاری، حدیث: 2298۔

33۔ التوبہ: 33۔

34۔ صحیح بخاری، حدیث: 6229۔

35۔ ایضاً۔

36۔ النساء: 77۔

37۔ الحج: 39۔

38۔ تفصیلات کے لیے دیکھیں ''نقش حیات''، از مولانا سیّد حسین احمد مدنی، ج: 2، ص: 11 تا 38، طبع: مکتبہ دینیہ، دیو بند

39۔ الانفال: 60۔

☆

www.rahimia.org

بیا به مجلسِ مشائخ

خانقاہِ رائے پور کی دینی خدمات

تحریر: پروفیسر محمد انس حسان

خانقاہِ رائے پور کا تعارف

رائے پور سہارن پور شہر سے شمال کی جانب تقریباً 36 کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے صوبے یو۔ پی میں واقع ہے۔ اس کا شمالی حصہ کوہ شوالک کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے ندی نالوں کی بہتات، سرسبز و شاداب اور دل فریب مناظر سے بھرپور ہے۔ یہ قصبہ رائے پور میں بسنے والے راؤ صاحبان کے جدِ امجد راؤ شیخ چند (مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام شری چند تھا) کے بیٹے راؤ ہیتم خان نے 1523ء میں آباد کیا تھا۔ [1] اس طرح اس قصبے کو آباد ہوئے تقریباً پانچ سو سال ہوگئے ہیں۔ رائے پور میں خانقاہ کی بنیاد دراصل مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (1853ء-1919ء) نے رکھی جو ۱۳۰۳ھ/ 1886ء میں اپنے مرشد میاں عبدالرحیم سہارن پوری (متوفی 1886ء) کے حکم پر رائے پور کے قریب گاؤں ''عالم پور'' میں واقع ''مادھو والا باغ'' میں خیمہ زن ہوئے۔ ۱۳۰۳ھ/ 1886ء میں آپؒ کے شیخ کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے ۱۳۰۷ھ/ 1890ء میں آپ نے اپنے ننھیالی زمین پر رائے پور میں قیام فرمایا اور ایک مدرسہ ''تعلیمِ قرآن'' کا قائم کیا۔ بعد میں یہی مدرسہ ''گل زار رحیمی'' کے نام سے موسوم ہوا اور اسی مبارک مقام کو ''خانقاہِ رحیمیہ رائے پور'' کا اعزاز حاصل ہوا، جس سے ہزارہا نفوس نے دین کی جامعیت کا سبق حاصل کیا۔

یہ خانقاہ بنیادی طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703ء-1762ء) کے سلسلے کے بزرگوں سے متعلق و متأثر رہی ہے۔ چناں چہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (1817ء-1899ء)، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (1833ء-1880ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (1829ء-1905ء) نے اس خانقاہ کی ہمیشہ سرپرستی کی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1851ء-1920ء) نے جب انگریز سامراج کے خلاف تحریکِ آزادی کو ایک نئے دور میں داخل کیا تو اس خانقاہ کے مشائخ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور مخلوقِ خدا کی روحانی و اَخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کو غلامی کی دلدل سے نکالنے کی بھی جدو جہد کی۔ اس سلسلے میں اس خانقاہ نے اپنے دور میں بپا آزادی کی تحریکات میں بھرپور حصہ لیا۔ اس خانقاہ نے اپنے دور کی روایتی خانقاہوں کے برخلاف فکری، علمی اور عملی میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ [2] خانقاہِ رائے پور کا عمومی مزاج ہے کہ اس خانقاہ نے دین کی جامعیت کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ چناں چہ اس خانقاہ نے شریعت، طریقت اور سیاست کے میدان میں مساوی طور پر کردار ادا کیا۔

خانقاہ رائے پور کی خصوصیت

خانقاہِ رائے پور کے مشائخ نے تصوف میں انسان دوستی اور تزکیۂ نفس کے اجتماعی ثمرات پر بہت زور دیا ہے۔ چناں چہ اس

خانقاہ کے عمومی مزاج میں طویل مجاہدے اور اذکار کے بجائے عملیت پسندی اور اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کرنے کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خانقاہ کی تعلیمات عام فہم اور انسانی فطرت سے قریب تر ہیں۔ خانقاہِ رائے پور روایتی خانقاہوں سے ہٹ کر اندھی تقلید اور غیر اسلامی وغیر شرعی رسم ورواج کی قائل نہیں ہے۔ اس خانقاہ کے مشائخ روحانیت میں بلند مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے گردوپیش کے حالات سے بھی مکمل آگاہی رکھتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے خانقاہ کی چار دیواری میں محصور ہونے اور سماج کے عصری تقاضوں سے لاتعلق و بے خبر رہنے کا مزاج اس خانقاہ کا کبھی نہیں رہا۔

یہ بات درست ہے کہ خانقاہِ رائے پور کی دینی جدوجہد اور تحریکِ آزادی میں کردار کا تذکرہ کم کم ملتا ہے، لیکن اس میں اِخفا کا پردہ پیشِ نظر رہا۔ گوشۂ عزلت اور گم نامی میں رہ کر قومی و ملّی تحریکات کی سرپرستی اس خانقاہ کا خصوصی امتیاز ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ (1872ء۔ 1944ء) لکھتے ہیں کہ:

> ''عام طور پر لوگ تحریکِ آزادی میں رائے پور کی سیاسی اہمیت کو پوری طرح نہیں جانتے، میں اس سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں رائے پور نے جو کردار ادا کیا ہے، اس پر مضامین اور کتابیں لکھوں، لیکن کیا کروں کہ حضرت اقدس رائے پوری (مولانا شاہ عبدالرحیمؒ) اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور ہمیں اس کے بیان سے منع کیا ہوا تھا۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا رائے پور کے سیاسی کردار سے اچھی طرح آگاہ ہوگی۔''(3)

خانقاہِ رائے پور کے مشائخ

اس خانقاہ کے اب تک کے پانچ مشائخ کے اسماء درج ذیل ہیں:

1۔ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ (1853ء-1919ء)
2۔ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ (1873ء-1962ء)
3۔ مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ (1905ء-1992ء)
4۔ مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ (1926ء-2012ء)
5۔ مولانا شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ (مسند نشین)

ذیل میں ہم اس خانقاہ کے مشائخ کا تعارف کراتے ہوئے ان کی دینی فکر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

1۔ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی ولادت ۱۲۷۰ھ / 1853ء میں ''تِگری'' میں ہوئی۔ آپؒ کے والد اشرف علی خاںؒ کا تعلق حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے انتہائی گہرا تھا۔ آپؒ کا نام ''عبدالرحیم'' بھی حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے ہی رکھا تھا۔(4) آپؒ کے آباؤ اجداد کا اصل تعلق قصبہ ''گمتھلہ''(5) سے تھا۔ جدی جائیداد کی تقسیم کے سبب آپ کے جدِ امجد بابا طاہر (خاں)(6) موضع تِگری تشریف لے آئے تھے۔ آپؒ کے والدِ محترم کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سیّدالطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بہت گہرا تھا۔ چناں چہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے

بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ آپؒ کے والدِ ماجد کے مہمان بنے تھے۔ (7) حفظِ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن ''تِگری'' ہی میں حاصل کیں۔ بعدازاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مشورے پر مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۱ھ/1874ء میں درسِ نظامی کی تکمیل فرمائی۔ آپؒ کے اساتذہ میں اکثر وہ حضرات ہیں، جنھوں نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ (8) دورانِ تعلیم ہی آپؒ کا تعلق میاں عبدالرحیم سہارن پوریؒ (9) سے ہوگیا تھا، جنھوں نے آپؒ کو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت فرمایا اور بعدازاں مجاز بھی کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ آپؒ اپنے گاؤں ''تِگری'' میں رہے۔ اسی دوران آپؒ کی شادی رائے پور کے ایک معزز خاندان میں ہوئی، جن سے ایک صاحبزادے حافظ عبدالرشید (متوفی 1910ء) اور ایک صاحبزادی (وفات 1909ء) والدہ محترمہ شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ پیدا ہوئے۔ اپنے شیخ کے انتقال کے چار سال بعد آپؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی صحبت بابرکت میں رہے۔ حاجی صاحبؒ نے آپؒ کو اجازت وخلافت مرحمت فرمائی اور واپس جاکر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے رابطہ قائم کرنے کی تاکید فرمائی۔ (10) چناں چہ آپؒ حضرت گنگوہیؒ کے پاس تشریف لائے اور انھوں نے آپؒ کو بیعت کیا اور بیعت کے ساتھ ہی مجازِ طریقت بنایا۔

(الف) سلاسل تصوف کی جامعیت

شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سلاسل تصوف کی جامعیت کے قائل تھے اور اس کے اثرات نمایاں طور پر ان کے مزاج اور طریقہ تربیت میں (جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں) دیکھے جاسکتے ہیں:

(1) ابتدائی ذکر واذکار، فکر وشعور کی بلندی اور روحانی ترقی وعروج کے حوالے سے آپ میں سلسلۂ ''قادریہ'' کا رنگ نمایاں تھا۔

(2) جذب وکیف اور قبولیتِ عامہ، نیز عوامی رابطے کے لحاظ سے آپ میں سلسلۂ ''چشتیہ'' کا ظہور ہوتا تھا۔

(3) سلوک کے ادب وآداب اور نظم ونسق اور انتظامی صلاحیت کے شعور اور طبعی اُنس وطمانیت کے حوالے سے آپؒ میں سلسلۂ ''سہروردیہ'' کا اثر دکھائی دیتا تھا۔

(4) طبیعت ومزاج میں ٹھہراؤ، عقل وفہم میں پختگی اور فکر وشعور میں ضبط وگہرائی کے حوالے سے آپؒ میں سلسلۂ ''نقشبندیہ'' کا رنگ غالب تھا۔

(5) حضرات مشائخ ''مجددیہ'' کی شریعت، طریقت اور سیاست کے حوالے سے تجدیدی شان کا رنگ بھی انتہائی پختہ ہے۔

(6) ''سلسلۂ ولی اللّٰہی'' کے مربوط فکر وفلسفہ اور تجدیدی عمل کی جامعیت، نیز نقل، عقل اور کشف کی بلند تر حالت نے آپ کی ذات کو انتہائی نمایاں کردیا ہے۔ (11)

(ب) اجتماعی تزکیہ اور انسانیت

شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے خانقاہی نظام میں انفرادی تزکیہ اور للّٰہیت سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے اجتماعیت اور انسانیت سے مربوط کیا۔ آپؒ کے ہاں اجتماعیت اور انسانیت ہر چیز پر مقدم تھی اور یہی نقطہ نظر اس منتشر خطے کو ایک وحدت دے سکتا تھا۔ چناں چہ آپؒ کی انسان دوستی کے حوالے سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کا بیان ہے کہ:

www.rahimia.org

''مخلوق کی دل جوئی و مدارات بھی آپؒ میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا کہ حضرتؒ کو سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ ہے...... دلداری خلق کا رنگ آپؒ پر اتنا غالب تھا کہ پیاری سی پیاری چیز اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی''۔ (12)

آپؒ تصوف کو محض ذہنی آسودگی اور انفرادی تزکیہ تک ہی محدود نہیں کرتے تھے اور نہ ہی آپؒ کے نزدیک تصوف گوشہ نشینی وعزلت نشینی ہی کا نام تھا، بلکہ اس کے برعکس آپؒ تصوف کو عملیت پسندی اور اجتماعی ذمہ داری کے تناظر میں دیکھتے تھے۔ تصوف کے حوالے سے آپؒ کا ذہن بڑا عملیت پسند تھا۔ آپؒ کے نزدیک تصوف ظاہری طور پر محض ذہنی آسودگی اور روحِ حیوانی کی تسکین کا نام نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ عقل وشعور کی بالیدگی اور قلب کے پختہ عزم وہمت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کے لیے بہترین فکروعمل کی تحریک پیدا کرنا تصوف کا انتہائی اعلیٰ مقصد ہے۔ (13)

(ج) دینی وعصری علوم وفنون کی ترویج

آپؒ کو دینی وعصری علوم وفنون کی ترویج کا بہت شوق تھا۔ اس مقصد کے تحت آپؒ نے قرآنی تعلیم وتعلم کے لیے ایک مدرسہ ''فیضِ ہدایت'' کے نام سے قائم فرمایا تھا۔ آپؒ نے اس مدرسہ کو چلانے کے لیے سرمایہ داروں سے مدد نہیں مانگی، بلکہ اپنی بساط کے مطابق اسے چلانے کے لیے خود اپنی زمین اور کتب خانے کو اس مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ آپؒ طلبا کو آج کل کے بعض مدارس کے طلبا کی طرح کاہل اور معاشرے سے کٹا ہوا نہیں رکھنا چاہتے تھے، بلکہ ان میں جفاکشی، سادگی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے قائل تھے۔ (14) آپؒ چاہتے تھے کہ اس مدرسے میں بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی عقائد اور شرعی احکامات کی تعلیم بھی دی جائے۔ اس مقصد کے تحت آپؒ نے مفتی کفایت اللہ دہلویؒ (1875ء۔ 1953ء) سے ''اصولِ اسلام'' اور ''تعلیم الاسلام'' کے نام کے دو رسائل بھی لکھوائے تھے، جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ آپؒ انگریز دشمنی کے طویل پسِ منظر کے باوجود عصری علوم وفنون کے مخالف نہیں تھے اور نہ ہی ان علوم کے حاملین سے نفرت کرتے تھے، بلکہ آپؒ عصری و دینی دونوں طبقات کی مشترکہ جدوجہد کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے تھے۔ چناں چہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' (15) کے تحت نوجوانوں میں دینی فکر کی ترویج واشاعت اور تحریک آزادی کی سوچ پیدا کرنے کے لیے جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے کام کرنے کے لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو تیار کیا تو اس کی تاسیس کی مشاورت اور سرپرستی میں حضرتؒ بھی شامل تھے۔

(د) مدارسِ دینیہ کی ضرورت

آپؒ مدارسِ دینیہ کو اس خطے میں دین اسلام کے فروغ کے لیے ضروری خیال فرماتے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو آپؒ پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اپنی حیات ہی میں آپؒ کو دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا (16) اور حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد ان کے قائم مقام کی حیثیت سے آپؒ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی طرح مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی سرپرستی بھی آپؒ نے حضرت گنگوہیؒ ہی کے حکم سے قبول کی۔ (17) ان مدارس کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ آپؒ نے مکاتب اسلامیہ و مدارس دینیہ کا ایک مربوط نظام قائم فرمایا اور ان مدارس کی آپؒ نے تمام عمر سرپرستی اور رہنمائی فرمائی۔ آپؒ کے قائم کردہ مدارس میں ابتدائی دینی تعلیم کے

ساتھ ساتھ ریاضی اور دیگر عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مدارس کے اساتذہ کے لیے ضابطہ اخلاق تیار کیا گیا تھا، جس کی رو سے ان کی اپنی تربیت بھی کی جاتی تھی اور طلبا پر بھی بے جا سختی کے بجائے ان کی صلاحیت اور مزاج کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔

(ر) آزادی کی سوچ اور فلسفۂ حریت

آپؒ اس خطے میں انگریز سامراج کے وجود کو مسلمانوں کی غلامی کا باعث قرار دیتے تھے۔ آپؒ کی سوچ یہ تھی کہ برصغیر سے انگریز کے انخلا کے لیے متحدہ قومی جدوجہد ناگزیر ہے۔ چناں چہ ۱۳۰۳ھ/ 1885ء میں جب آپؒ کے شیخ مولانا گنگوہیؒ نے متحدہ قومی جدوجہد کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی تائید میں فتویٰ دیا تو مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ (1852ء۔ 1927ء) اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ساتھ آپؒ نے بھی اس کی بھرپور تائید فرمائی۔ [18] اسی طرح ''جمعیۃ الانصار'' اور ''نظارۃ المعارف'' کے تحت نوجوانوں میں جس دینی فکر کی تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے شروع کی تھی اس کی سرپرستی بھی آپؒ ہی نے فرمائی۔ برعظیم میں تحریک آزادی کا کام شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ بھی اس تحریک میں پورے طور پر شامل رہے۔ چناں چہ انگریز سامراج کے انخلا کے حوالے سے تحریک ریشمی رومال کا آغاز ہوا تو اس میں بھی آپؒ کا بڑا اہم کردار رہا۔ چناں چہ مولانا سندھیؒ نے جب اس تحریک کے منصب داران کی فہرست مرتب کی تو آپؒ کا نام بھی اس میں شامل تھا۔ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''(آپؒ) ''تحریکِ ریشمی رومال'' کی سرپرستی، رہنمائی اور نگرانی کا کام انتہائی جرأت وہمت اور بڑی اولوالعزمی کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ آپؒ نے اپنے ہم راز دوستوں کے ساتھ مل کر انتہائی جبر وآمریت اور دہشت کے ماحول میں ظالم انگریز کے خلاف آزادی کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کی سرپرستی کی۔'' [19]

۱۳۳۶ھ/ 1917ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے گئے تاکہ اپنی محنت کو آخری مراحل میں داخل کر کے انگریز سامراج کے انخلا کے عمل کو حتمی شکل دے سکیں تو باوجود یہ کہ آپؒ نے شیخ الہندؒ کے تشریف لے جانے کو درست خیال نہیں کیا، لیکن پھر بھی حضرت شیخ الہندؒ آپؒ کو اپنا قائم مقام بنا کر گئے۔ اس حوالے سے مولانا حسین احمد مدنیؒ (1879ء - 1957ء) کے مطابق حضرت شیخ الہندؒ حجاز جانے لگے تو انھیں (حضرت رائے پوریؒ) کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو میرا قائم مقام سمجھنا۔ [20]

حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد ان کی تحریک کی سرپرستی بھی آپؒ ہی نے فرمائی۔ چناں چہ پنجاب کی سی آئی ڈی پولیس کے ریکارڈ میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عدم موجودگی میں آپؒ ان کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ [21] اگرچہ ''تحریکِ ریشمی رومال'' ناکام ہوئی، تاہم حضرت عالی رائے پوریؒ نے یہ ضروری سمجھا کہ جیسے ہی حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے واپس تشریف لائیں تو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ان کی تحریک کو منظّم کریں، لیکن آپؒ کی زندگی نے وفا نہ کی اور آپؒ 28 جنوری 1919ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور یہ ذمہ داری اپنے قائم مقام مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے سپرد کر گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا سے واپس تشریف لائے تو اپنے رفیق اور دوست کی قبر پر رائے پور بھی تشریف لے گئے اور کافی دیر تک

غمزدہ اور خاموش رہے۔

(2) مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کا تعلق تھوہا محرم خاں تحصیل تلہ گنگ ضلع کیمبل پور (مغربی پنجاب) کے راجپوت علمی گھرانے سے تھا۔ آپؒ کے والد حافظ احمد صاحبؒ کو قرآنِ کریم سے خصوصی لگاؤ تھا۔ چناں چہ تمام زندگی قرآن پڑھایا۔ آپؒ کا نام والدین نے غلام جیلانی رکھا۔ جب آپؒ رائے پور حاضر ہوئے تو آپؒ کے شیخ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے آپؒ کا نام عبدالقادر رکھا۔ آپؒ کے والدِ محترم حافظ احمد صاحب کی شادی ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں موضع ڈھکوال میں ہوئی تھی، جو ڈھڈیاں گاؤں سے تین یا چار میل کے فاصلے پر واقع تھا، لیکن اہلیہ کا کچھ عرصے بعد انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر تک آپؒ نے دوسری شادی نہیں کی۔ ایک مجذوب کی پیشین گوئی پر موضع للیانی ضلع سرگودھا کے ایک معزز خاندان میں دوسرا نکاح کیا اور انہی سے مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ تولد ہوئے۔ آپؒ کی سنِ ولادت کا درست علم تو نہیں، البتہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بعض قرآئن کی روشنی میں ۱۲۹۰ھ/1873ء کے بعد آپؒ کی ولادت ہونا قرار دیا ہے۔ [22] تاہم مجالس حضرت رائے پوریؒ کے مؤلف نے اس کتاب کے مقدمے میں 1875ء کو سن ولادت قرار دیا ہے۔ [23] مفتی محمد سلیمان قاسمی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ [24]

مروّجہ تعلیم کے حصول کے بعد آپؒ بریلی میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856ء۔ 1921ء) کے بچوں کو کچھ عرصہ پڑھاتے رہے۔ بعد ازاں دہلی تشریف لے گئے۔ جس وقت آپؒ دہلی تشریف لے گئے ہیں، اس وقت دہلی بالخصوص اور ہندوستان بالعموم انگریز سامراج کی فرقہ واریت کی آگ میں سُلگ رہا تھا۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کی شدومد سے تنقید کرنے اور اسے کافر قرار دینے پر تُلا ہوا تھا۔ آپؒ کو یہ فتویٰ بازی کا ماحول بالکل پسند نہ آیا اور اس عمل نے آپؒ میں بے چینی پیدا کردی۔ [25] اسی اثنا میں آپؒ نے شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اجازت طلب کی اور اجازت ملنے پر رائے پور تشریف لے آئے۔ رائے پور کے قیام میں آپؒ نے اپنے شیخ کے زیرِ سایہ مجاہدہ، ریاضت اور تربیت کے تمام مراحل انتہائی عزم و ہمت اور جاں فشانی سے طے کیے۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے آپؒ کو اولاً سلسلہ قادریہ میں بیعت فرمایا۔ جب آپؒ نے منازلِ سلوک طے کرلیں تو پھر بعد میں چاروں سلسلوں میں بھی اجازت وخلافت عطا فرمادی۔ [26] آپؒ کو اپنے شیخ سے والہانہ محبت تھی اور بڑی تن دہی سے ان کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ تاہم یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی، بلکہ حضرت عالی رائے پوریؒ بھی آپؒ سے حددرجہ محبت کرتے تھے۔ آپؒ کو اپنے سفر وحضر میں ساتھ رکھتے اور ۱۳۲۷ھ/1910ء میں جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپؒ کو بھی ساتھ لے گئے اور قریب چودہ سالہ رفاقت میں مکمل توجہ آپؒ پر مبذول رکھی۔ جانشینی کے بعد آپؒ کے اخلاص، للّٰہیت اور جذبے نے خانقاہ رائے پور کو مرجع خاص وعام بنادیا۔ خانقاہ کو عوامی سطح پر جو کچھ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ آپؒ ہی کی محنت اور خلوص کے نتیجے میں ہوئی۔ ذکر واذکار اور دیگر باطنی اشغال نے خانقاہ کے ماحول کو پرکیف اور اثرانگیز بنادیا تھا۔ کوئی بھی شخص اس ماحول سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ سلاسلِ تصوف کی جامعیت نے آپؒ کی سوچ میں جو توازن اور اعتدال پیدا کردیا تھا، اس کی وجہ سے مسلکی اور فروعی اختلافات سے بالاتر ہوکر ہر طبقے کے لوگ تزکیۂ نفس کے لیے اس خانقاہ کا رُخ کرتے اور انسان دوستی اور اعلیٰ اَخلاق کی تعلیم کے ساتھ اجتماعیت کا درس حاصل کرتے۔ بیعت کے سلسلے میں آپؒ کا معمول

www.rahimia.org

بڑا عجیب تھا۔ چناں چہ آپؒ علمائے کرام کو بیعت کرنے میں اگر چہ بہت متأمل اور محتاط تھے، مگر عوام کو اللہ کا نام سکھانے اور ان کو توبہ کرا دینے میں بہت وسیع الظرف اور محنت سے کام لیتے تھے۔ اس عمل سے ان کے فلسفۂ تصوف کی عوامیت اور عام انسانوں تک رابطے کی استواریت کا پتہ چلتا ہے۔

(الف) شیخ الہندؒ کی جماعت کا فکری تسلسل

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے اپنے دوست اور ہم راز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہر تحریک میں ساتھ دیا تھا اور اپنے انتقال سے قبل مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو وصیت فرما گئے تھے کہ ان کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی جماعت کا ہمیشہ ساتھ دیں۔ چناں چہ جب حضرت شیخ الہندؒ نے اگلے دور میں پارٹی سیاست کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ علماءِ ہند قائم کی تو آپؒ نے اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کیا۔ چناں چہ جو تعلق حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت عالی رائے پوریؒ کے درمیان تھا وہی تعلق شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مابین بھی تھا۔ اسی طرح بعض حضرات نے جب حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ پر نقد فرمایا تو آپؒ نے ان کے شکوک وشبہات کو دور کیا اور فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس کی تعریف کریں میں تو ان کے متعلق نیک گمان ہی رکھتا ہوں۔ آپؒ نے حضرت سندھیؒ کا ہمیشہ بھرپور دفاع کیا۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی تعزیت پر جب حضرت شیخ الہندؒ خانقاہِ رائے پور تشریف لائے تو آپؒ نے اپنے حق میں دعا کی درخواست کی۔ اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ابھی کیا کچھ کمی ہے کہ دعا کروں۔ (27) گویا اس طرح آپؒ پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی جانشینی کی توثیق کر دی۔

(ب) رسوم وقیود سے آزاد مزاج

آپؒ کے ہاں روایتی خانقاہوں کا سا مزاج نہیں تھا، بلکہ یہ خانقاہ رسوم وقیود سے آزاد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کی مجلس میں عصری علوم کے حاملین اور مدارسِ دینیہ کے فاضلین اور نوجوانوں کو برابر درجہ دیا جاتا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''رائے پور کی خانقاہ چوں کہ رسوم وقیود سے بہت آزاد اور حضرتؒ کی طبیعت مبارک بہت جامع، وسیع اور داروگیر سے دور تھی، نیز مختلف ماحول اور طبقات کے لوگوں کا آپؒ سے تعلق اور عقیدت اور آپؒ کو ان سے محبت تھی، اس لیے ...... جدید تعلیم یافتہ اور قدیم مدارس کے فضلا اپنی اصلاح وتربیت اور اپنے اپنے خلا کی تکمیل کے لیے حاضر ہونے لگے۔'' (28)

(ج) نوجوانوں کی تربیت کا انداز

آپؒ نوجوانوں سے بہت محبت فرماتے تھے اور اس معاملے میں کالج اور مدرسہ کے نوجوانوں کے ساتھ مساوی رویہ تھا۔ آپؒ نوجوانوں کے ذاتی افعال اور خرابیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے وسیع تر مفادات کے لیے انھیں اپنے قریب کر کے ان کی اصلاح کے قائل تھے۔ چناں چہ نوجوانوں پر تنقید کرنے کے بجائے اس نظام کی خرابی واضح کرنے پر یقین رکھتے تھے، جس نے نوجوانوں کے اَخلاق خراب کر دیے ہیں۔ اس حوالے سے آپؒ کے نقطہ نظر کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ ایک شخص نے لباس کے متعلق عرض کیا تو فرمایا: اسلام نے کوئی خاص پوشاک مقرر نہیں فرمائی۔ پوشاک کا مقصد جسم کا ستر ہے، اس لیے جس لباس سے ستر پوشی ہو وہ جائز ہے۔ (29)

2۔ ایک نوجوان نے (جو کالج میں پڑھتے تھے) بعض مقاصد کے لیے ''آیتِ کریمہ'' پڑھنے کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا اس مالیخولیا میں مت پڑو اور رضائے الٰہی کے لیے پڑھنا سیکھو۔ (30)

3۔ ایک کالج کے نوجوان نے گزارش کی کہ آپ میرے والد کو تحریر کر دیں تاکہ میں انگریزی تعلیم چھوڑ دوں۔ آپؒ نے فرمایا کہ تم نیت کر لو کہ اس علم سے دین کی خدمت کروں گا۔ (31)

(د) سرمایہ پرستی کی مذمت

آپؒ سرمایہ پرستوں اور جاگیرداروں کی اس بنا پر مخالفت کرتے تھے کہ یہ لوگ استحصالی سوچ کے زیرِ اثر مزدوروں اور کسانوں کو ان کے جائز حق اور بنیادی انسانی ضروریات سے محروم رکھتے ہیں۔ آپؒ علما کے طبقے کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ باہمی ابحاث و مجادلہ کو چھوڑ کر ان عملی مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ چناں چہ لکھتے ہیں کہ:

''لوگوں کو مذہبی لڑائی کے بجائے اب زمین دار، کاشت کار اور مزدور سرمایہ دار وغیرہ سوالات پر لڑنا چاہیے۔ اس سے مذہب کو بدنام کرنے کا قصہ تو ختم ہو جائے گا، ورنہ یہ خیال ہے کہ مذہب بدنام تو اب بھی ہے (مذہبی لڑائی پیدا کی گئی تو) اَور بھی زیادہ بدنام ہو جائے گا۔'' (32)

آپؒ نے معاشیات اور روحانیت کے باہمی ربط کو بھی واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب تک معاشی حالت اچھی نہ ہوگی، اس وقت تک اَخلاقی، سماجی اور روحانی ترقی بھی نہ ہوگی۔ چناں چہ عبادات اور حقوق کے اسلامی فلسفے کو مؤثر بنانے کے لیے معاشی حالت کی درستگی بہت ضروری ہے۔

(ر) سیاسی تحریکات کی سرپرستی

آپؒ کی سیاسی بصیرت بڑی گہری تھی۔ اس دور کی تمام تحریکوں، سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق ایسی جچی تلی رائے رکھتے تھے، جس سے زیادہ معقول و مناسب رائے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مدبر بھی قائم نہیں کر سکتا تھا۔ آپؒ نے اپنی مؤمنانہ فراست سے ہمیشہ سیاسی زعما کی رہبری فرمائی۔ چناں چہ جمعیۃ علماءِ ہند، مجلس احرارِ اسلام اور کانگریس وغیرہ کے بعض لیڈروں کو بروقت نہایت مفید اور قیمتی مشورے دیے۔ (33) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جو کہ احرار کے بانی تھے، آپؒ ہی سے تعلقِ بیعت رکھتے تھے۔ مسجد شہید گنج اور دیگر کئی مسائل پر جب انگریز نے ''احرار'' کو تشدد کی راہ پر چلانے اور حقیقی مسائل سے دور کرنے کی کوشش کی تو حضرتؒ کی سیاسی فراست نے ''احرار'' کو اس مسئلہ میں الجھنے سے بچایا۔ (34) آپؒ کی معیت میں خانقاہِ رائے پور آزادی پسند تحریکات کی مشاورت کا مرجع بنی رہی اور اس خانقاہ نے روایتی خانقاہوں سے ہٹ کر ان تحریکات کی مکمل سرپرستی فرمائی۔

(س) اسلامی نظام کے قیام کی سوچ

آپؒ اسلامی نظام کے قیام کے لیے پہلے درجے میں قومی سوچ کی بیداری اور جدید علوم و فنون کی استعداد کو ضروری خیال

فرماتے تھے۔ ان حالات میں جب کہ مسلمانوں میں جماعت سازی کا فقدان اور جدید علوم وفنون کی کمی ہے، حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپؒ مسلمانوں کو اپنا دین محفوظ رکھتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ:

''اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہوسکتا، اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم وفنون سیکھنے ہوں گے، مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین ومذہب کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں، جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، اس زمانہ میں دین ودنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتا۔''(35)

(ص) دین و دنیا کی تفریق کی نفی

ہمارے ہاں بعض حضرات نے دین ودنیا کی تفریق اس بنیاد پر کر رکھی ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ تو ''دین'' ہے اور سیاست اور معیشت کے امور ''دنیا'' کے کام ہیں۔ تاہم حضرت اس طرزِ فکر کے شدید ناقد تھے، چناں چہ فرماتے تھے کہ:

''نیک نیتی سے ملک کی (سیاسی، معاشی اور دفاعی) طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے، سب دین ہی ہے...... صالح نیت سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے، سارے کا سارا دین ہی دین ہے۔''(36)

(ط) قومی و بین الاقوامی امور پر نگاہ

آپؒ حالات حاضرہ اور قومی وبین الاقوامی امور سے باخبر رہتے تھے۔ چناں چہ جہاں خانقاہ میں اکابرین کی دیگر کتب پڑھی جاتی تھیں وہیں اخبارات وغیرہ بھی پڑھے جاتے تھے۔ مفتی محمد سلیمان قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''آپؒ حالاتِ زمانہ اور بیرونی ممالک کی خبروں سے واقف رہنے کا بڑا اہتمام فرماتے۔ اخبارات کی اہم خبروں اور اہم مضامین نیز سائنس کی کھوج اور جدید خبروں اور جدید معلومات کے سننے کا ساری عمر اہتمام رہا۔ آپؒ خبریں سننے کو کبھی کبھی اپنا وظیفہ کہا کرتے تھے۔''(37)

آپؒ کی طبیعت ۱۳۷۴ھ/ 1955ء سے کافی خراب رہنے لگی تھی۔ اس لیے آپؒ کو فکر تھی کہ خانقاہ اور مدرسہ کا یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہے۔ اس حوالے سے کئی مشورے بھی ہوئے اور مختلف تجاویز مختلف اوقات میں سامنے بھی آئیں۔ تاہم مولانا حافظ عبدالعزیز رائے پوریؒ (نواسہ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) کو پاکستان سے بلایا گیا اور حضرت نے ان کو رائے پور میں قیام کے لیے تجویز فرمایا۔ اور حضرت کے حکم سے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے مجمعِ عام میں یہ اعلان فرمایا کہ حضرت نے حافظ صاحب کو یہاں قیام کے لیے تجویز فرمایا ہے اور حافظ صاحب نے بھی اس کو قبول فرمالیا، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، ہمیں تو بڑا فکر ہو رہا تھا کہ یہاں یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ چناں چہ ۱۳۸۱ھ/ 1962ء کو حضرت اپنے بعض متوسلین کی خواہش پر شدید بیماری کے باوجود پاکستان تشریف لائے۔ اس دوران آپؒ کی طبیعت بہت خراب ہوئی، کچھ افاقہ ہوتا تو ہندوستان واپسی کا تقاضا کرتے۔ بیماری کا یہ سلسلہ 16 اگست 1962ء کو ختم ہوا اور آپؒ اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں پہنچ کر سرخرو ہوئے۔

(3) مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ

مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کا آبائی وطن گمتھلہ''، ضلع کرنال ہے۔ آپؒ کی ولادت باسعادت 16 جولائی 1905ء بروز

جمعۃ المبارک کو اپنے آبائی علاقے میں ہوئی۔ آپؒ قطب عالم مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے نواسۂ حقیقی ہیں اور آپؒ کو اعزاز حاصل ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی پندرہ سال جو کہ فکر وشعور کی بالیدگی اور ارتقاء کا دور ہوتا ہے وہ اپنے نانا کی تربیت میں گزارے۔ [38] آپؒ کے والد چودھری تصدق حسین (داماد حضرت عالی رائے پوری) حضرت گنگوہیؒ سے بیعت اور انتہائی ذاکر و شاغل اور دینی فہم وبصیرت کے حامل تھے۔ آپؒ نے مسلسل سات برس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں رہ کر مکمل انہماک اور توجہ سے درسِ نظامی کی کتب پڑھیں اور ۱۳۴۳ھ / 1924ء میں انیس برس کی عمر میں تمام ظاہری علوم سے فراغت حاصل کی۔ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ آپؒ کو سفر وحضر میں اپنے ساتھ رکھتے اور حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ چناں چہ ۱۳۴۵ھ / 1927ء میں جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپؒ کو خاص طور پر اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے (جو کہ اس وقت جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے) خصوصی طور پر ملاقات کروائی۔ حجاز میں ہونے والی ان ملاقاتوں میں جو مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مابین ہوئیں ان میں صرف مولانا ہی کو شرکت کی اجازت تھی۔

۱۳۶۷ھ / 1947ء میں جب برِعظیم کی تقسیم کا عمل شروع ہوا تو مسلمانوں کے اقلیتی علاقوں میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپؒ کا علاقہ ''گمتھلہ'' سکھوں کی اکثریت والے علاقے میں واقع تھا جہاں فسادات کا سلسلہ شروع ہونا لازم تھا۔ آپؒ نے ان حالات کا انتہائی جانفشانی اور پامردی سے مقابلہ کیا اور جب فوج نے اس علاقے سے مسلمانوں کا زبردستی انخلا کیا تو آپؒ اپنے شیخ سے اجازت لے کر اپنے پورے قافلے کے ساتھ پاکستان تشریف لے گئے اور سرگودھا میں قیام فرمایا۔ [39] آپؒ کے تبلیغی و اصلاحی اسفار سال بھر جاری رہتے تھے۔ ہندوستان میں بھی یہ اسفار تسلسل کے ساتھ جاری رہتے۔ اپنے شیخ کے انتقال کے بعد آپؒ نے ہندوستان کے پانچ اسفار فرمائے اور چھٹا سفر موت کے بعد فرمایا۔ ان اسفار میں آپؒ نے رائے پور سمیت دہلی، سہارن پور، دیوبند اور مرادآباد وغیرہ میں خانقاہ رائے پور کے متوسلین و متعلقین میں فیوضات وانوارات تقسیم کیے اور اپنے مرشد وشیخ کے طریقے کو عام کیا۔

(الف) شریعت کی پابندی اور التزام

آپؒ کے باطنی کمالات اور اوصاف شریعت کے تابع تھے اور اپنی مشفقانہ طبیعت کے باوصف آپؒ کرامات کے متلاشی افراد کو شریعت کی استقامت پر ابھارتے تھے۔ آپؒ کی طبیعت عملیت پسندی اور حقیقت پسندی کی طرف مائل تھی اور آپؒ ہر اس عمل سے متنفر تھے جس میں شریعت کی پابندی کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے آپؒ کی شریعت سے محبت اور اکابرین وسلف کے طریقے پر ثابت قدمی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ کراچی میں آپؒ ''جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی'' میں مقیم تھے۔ ایک دوست کی پرزور دعوت پر شادی میں تشریف لے گئے۔ وہاں مکان کی سجاوٹ میں بجلی کے قمقموں کے ذریعہ انتہائی اسراف سے کام لیا گیا تھا۔ حضرتؒ چوں کہ سرمایہ داروں کے اسراف اور فضول خرچی کو ناپسند فرماتے اور اسے خلاف شرع سمجھتے تھے اس لیے واپس تشریف لے آئے۔ [40]

2۔ 1980ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے آئین کو معطل کر کے وفاقی شرعی عدالت قائم کی تو آپؒ نے دیگر آئینی ترامیم کے ساتھ ساتھ ''عائلی قوانین'' پر شدید تنقید کرتے ہوئے اسے خلاف شرع قرار دیا۔ [41] اسی طرح آپؒ نے اس دور کے نام

نہاد ''نظام زکوٰۃ'' اور ''نظام صلوٰۃ'' کے غیر موثر ہونے پر بھی بڑی کھل کر بات کی اور اس دور میں جن علماء نے آمریت کا ساتھ دے کر شریعت کے پردے میں سرمایہ داریت کو عملی طور پر پروان چڑھایا آپؒ نے ان علما کو ان کی حقیقی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے پر ابھارا۔

3۔ سنتِ رسول کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ کسی مجبوری سے کھانے سے قبل ہاتھ نہ دھو سکے تو خدام سے فرمایا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آج تک یہ سنت مجھ سے چھوٹی ہو۔ [42]

4۔ آپؒ کی خدمت میں جب پانی دم کرنے کے لیے کوئی عرض کرتا تو پہلے ایک گھونٹ پانی پیتے اور پھر دم کر کے دیتے۔ اس طرح ''سُؤرِ الْمُومِنِ شِفَاءٌ'' (مومن کا جھوٹا شفا ہے) والی حدیث پر بھی عمل ہو جاتا۔ اسی طرح آپؒ کی اس حدیث کی روشنی میں یہ عادت بھی تھی کہ ایک پلیٹ میں دو افراد مل کر کھانا کھائیں تا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے خیر کا باعث بن جائیں۔ [43]

(ب) طریقت اور اجتماعی تزکیہ کا باہمی ربط

شریعت کے التزام کے ساتھ ساتھ شعبہ طریقت میں بھی آپ کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ آپؒ نے اکابرین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے طریقت و سلوک کے ذریعے سوسائٹی میں اجتماعی تزکیہ اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے کام کیا۔ آپؒ کی روحانی تعلیمات میں محدودیت اور رجائیت کی بجائے وسعت اور عالمگیریت ہے جس کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگ آپؒ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپؒ کے روحانی فکر میں نوجوانوں کو بہت اہمیت حاصل تھی اور روایتی علما و صوفیا کی طرح وہ جدید تعلیم کے حامل نوجوان طبقے کو خود سے بدظن کرنے اور ان پر فسق و فجور کے فتوے داغنے کے قائل نہیں تھے۔ [44] آپؒ کے نزدیک اصلاحِ نفس کے لیے اولیاء اللہ کی صحبت بہت ضروری ہے۔ انفرادیت پسندی اور خود پسندی نے ہم میں اصلاحِ نفس کی سوچ ختم کر دی ہے۔ چناں چہ ہر فرد دوسرے پر تنقید تو کرتا ہے مگر اپنی اصلاح نہیں کرنا چاہتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اولیاء اللہ کی صحبت میں رہ کر پہلے مرحلے میں اپنی اصلاح کریں اور پھر سوسائٹی کی اجتماعی اصلاح کی جدوجہد کریں۔ آپؒ کے نزدیک اگر انفرادی و اجتماعی مفادات میں تصادم ہو تو اجتماعی مفادات کو مقدم رکھا جائے گا۔

(ج) سیاسی فہم و شعور

شریعت اور طریقت کے ساتھ ساتھ آپؒ اپنے اکابرین کی طرح سیاست کا بھی گہرا شعور و ادراک رکھتے تھے۔ آپؒ سیاست کو دنیاداری کے روایتی فکر کے تناظر میں دیکھنے والوں کی بجائے اسے دین کا اہم شعبہ قرار دیتے تھے۔ آپؒ نے اپنے شیخ کے طرزِ عمل پر اہلِ حق علماء کی سیاسی تحریکات کی مکمل سرپرستی اور رہنمائی فرمائی۔ چناں چہ قادیانیت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک ختم نبوت دراصل آپؒ ہی کی سرپرستی اور رہنمائی میں چلی تھی۔

آپؒ نے تقریباً تیس سال تک خانقاہ رحیمیہ رائے پور کی مسند کو رونق بخشی اور بالآخر 3 جون 1992ء کو آپؒ نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ نماز جنازہ آپؒ کے جانشین اور فرزند مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے پڑھائی اور وصیت کے مطابق آپؒ کے نانا مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے برابر میں تدفین ہوئی۔ آپؒ نے انتقال سے چار سال قبل ۱۴۰۹ھ/ 1988ء میں خانقاہِ رائے پور کی مسجد کے سامنے رائے پور کے وسیع میدان میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کو اپنا

جانشین نامزد کیا، جو 30 سال مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور 30 سال مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے۔

(4) مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ

مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ رجب ۱۳۴۴ھ بمطابق جنوری 1926ء اپنے آبائی وطن گمتھلہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ [45] یہ وقت ہے کہ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے وصال کو قریب سات سال گزر چکے تھے اور خانقاہ رائے پور کی مسند پر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ رونق افروز تھے۔ چوں کہ حضرت کے والد حضرت رائے پوری ثانیؒ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے، اس لیے آپ کا نام بھی انھوں نے ہی ''سعید احمد'' تجویز کیا۔ آپؒ نے ''جلالین'' تک کی کتب رائے پور میں رہ کر پڑھیں۔ اسی دوران ۱۳۶۷ھ/1947ء کی تقسیم کا معاملہ پیش آیا اور آپؒ کے والدِ محترم اپنے شیخ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے حکم پر پاکستان تشریف لے آئے۔ تاہم آپؒ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی معیت میں ان کے ساتھ رہے جن کا ارادہ یہ تھا کہ ان کے درسِ نظامی کے تکمیل کے آخری دو سال مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں مکمل ہوں۔ مدرسہ مظاہر العلوم میں تعلیم کے دوران آپ کا قیام و طعام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے گھر پر رہا۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد آپؒ اپنے مرشد مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے پاس واپس رائے پور تشریف لے آئے۔ شوال ۱۳۶۸ھ بمطابق اگست 1949ء میں عید الفطر کے بعد آپ کے استاد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ رائے پور تشریف لائے اور حضرت رائے پور ثانیؒ سے فرمایا کہ ''مولوی سعید احمد کو مزید ایک سال کے لیے مجھے دے دیں تا کہ تکمیل (منطق، فلسفہ وغیرہ علوم) میں وقت لگائیں۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا:

> ''بس جی! ہم نے جتنا اپنے برخوردار مولوی سعید احمد کو پڑھانا تھا پڑھا لیا، اس سے آگے نہیں پڑھانا۔ ہم نے کوئی اسے محض مدرس بنانا ہے۔'' [46]

یوں آپؒ کی ظاہری تعلیم مکمل ہوئی اور حضرت رائے پور ثانیؒ کی زیر سرپرستی باطنی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور کامل ایک سال (1949ء تا 1950) میں سلوک کی تکمیل کی اور یوں ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم یعنی تزکیہ نفس اور اس کے اجتماعی اثرات کو بھی مکمل اخذ کیا۔ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ آپؒ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے اور اپنی مجالس میں آپ کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ [47]

(الف) دینی و عصری طلبا کا اشتراک فکر و عمل

آپؒ کے مطابق مروجہ دینی و عصری تعلیم اور اس کے حاملین ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورے ہیں۔ چناں چہ دونوں میں باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اور مل کر چلنے کی سوچ کو بیدار کرنا ہوگا۔ اس سوچ کو عملی شکل دینے کے لیے آپؒ نے 12 مارچ 1967ء میں ایک تنظیم ''جمعیۃ طلبا اسلام'' قائم کی جس میں عصری تعلیمی اداروں کے طلبا کی فکری تربیت کے کام کو تنظیمی شکل دے کر ان کے لیے عملی جدوجہد کا ایک باقاعدہ پلیٹ فارم مہیا کیا۔ ''جمعیۃ طلبا اسلام'' بیس سال تک (1967ء تا 1987ء) آپؒ کی سرپرستی میں کام کرتی رہی۔ اس دوران اس جماعت نے تحریک ختم نبوت سمیت دیگر قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور

جن تحریکات کی پشت پناہی سامراج کررہا تھا اس کی مخالفت میں فعال کردار ادا کیا۔ اس دوران جو طلبا اپنی رسمی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں داخل ہوگئے تھے ان کی اجتماعیت کو ایک تشخص دینے کے لیے ایک تنظیم اور جماعت کی ضرورت پیدا ہوئی۔ چناں چہ 19، 20، 21 فروری 1987ء کو ملتان میں علماء اور فضلاء کے ایک اجلاس میں ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' قائم کی گئی۔ اس تنظیم نے دینی وعصری تعلیمی اداروں کے طلبا اور فاضلین کو منظّم کیا اور ان میں انسانی بنیادوں پر اجتماعی جدوجہد کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ تنظیم دراصل ''جمعیۃ طلبا اسلام'' کی تاسیسی شکل تھی جس میں ''جمعیۃ طلبا اسلام'' کے دائرہ کار کو وسعت دی گئی تھی۔

(ب) قرآنی تعلیمات عام کرنے کی کوشش

آپؒ مسلمانوں کی فلاح کے لیے قرآن سے رجوع کو ضروری خیال کرتے تھے۔ آپؒ کی خواہش تھی کہ عوام الناس میں بالعموم اور نوجوانوں میں قرآنی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ چناں چہ آپؒ نے ۱۴۲۱ھ/2001ء میں ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے نام سے ادارہ قائم کیا، جس کے اہداف ومقاصد درج ذیل تھے:

(1) علوم قرآنیہ کی بنیادی اور حقیقی تعلیمات نوجوان نسل کے سامنے پیش کرنا۔

(2) انسانی سماج کی تشکیل کے بنیادی علوم اور ان کے قرآنی اصول سے واقفیت بہم پہنچانا۔

(3) علوم قرآنیہ کی اساس پر روحانی، اخلاقی اور شعوری تربیت کا اہتمام کرنا۔ [48]

(ج) دین اسلام کی جامعیت

آپؒ دین کی جامعیت کے شعور پر بہت زور دیتے تھے۔ یہ آپؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ آپؒ نے دینی وعصری درسگاہوں کے نوجوانوں میں غلبہ دین کی سوچ، دین کی جامعیت کا نظریہ اور ولی اللّٰہی اکابرین کا حقیقی اور عملی تعارف کروایا جبکہ ان بزرگوں کے نام لیوا مدارس اور مذہبی جماعتوں میں بھی ان کا تعارف مفقود ہوتا جارہا تھا۔ آپؒ کی تربیت دین کے جامع فلسفے کے تناظر میں ہوئی تھی۔ آپؒ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح ماضی میں یہ خانقاہی نظام دین کی جامعیت (شریعت، طریقت، سیاست) کا فلسفہ پیش کرتا رہا ہے، آج پھر اس کے احیا کی ضرورت ہے۔ آپؒ دورِ حاضر میں خانقاہی نظام کے زوال کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آج خانقاہیں دین کے جامع فلسفے کی تربیت میں ناکام ہوگئی ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ:

> ''آج خانقاہی نظام دم توڑ رہا ہے۔ پہلے شریعت یعنی دین کی تعلیم، طریقت یعنی روحانیت کی طرف رجوع اور شریعت پر عمل کرنے کے لیے محرک اور سیاست یعنی راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کا مدبرانہ انداز، یہ دین کے تینوں شعبے مل کر کام کیا کرتے تھے اور ان سب کی سرپرستی کا شرف خانقاہِ رائے پور کو حاصل تھا۔ خانقاہِ رائے پور آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی الحمدللہ دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک چھاؤنی کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [49]

(د) تصوف کی مروجہ اصطلاحات کی اصلاح

آپؒ کے نزدیک ماضی میں خانقاہیں حجرہ نشینی اور ذاتی اصلاح کی سوچ پیدا نہیں کرتی تھیں بلکہ اجتماعی سوچ اور تربیت کا سبق دیتی تھیں۔ آپؒ خانقاہوں کے ماضی اور حال کے کردار کا تقابل کر کے ان کے مستقبل کے کردار کا مکمل لائحہ عمل پیش کرتے

ہیں۔ آپؒ کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ آپؒ نے تصوف کی رائج اصطلاحات کے حقیقی مفہوم، اثرات اور تقاضوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ مثلاً

(1) ''صبر'' کی مروّجہ قنوطی تعریف کے برعکس واضح کرتے ہیں کہ صبر کا معنی ہے اپنے پروگرام میں جم جانا کہ حالات نامساعد ہوں، مشکلات درپیش ہوں اور لوگ پروگرام کو ٹھکرائیں لیکن پروگرام پر یقین میں پختگی پیدا ہوتی چلی جائے۔ (50)

(2) ''توکل'' کا عام مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ بغیر عمل کے دعا میں لگے رہنا۔ لیکن آپؒ فرماتے ہیں کہ اگر عمل اختیار کیے بغیر گھروں میں بیٹھ کر فتح یابی کی دعا ہو اور اس سے خدائی فیصلوں کا انتظار ہو یہ دعا محض آرزو اور خواہش ہے۔ یہ عمل اور قربانی سے روکنے والی ہے۔ (51)

(3) ''زہد'' کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دنیا سے بالکل کنارہ کر لیا جائے لیکن آپؒ کے مطابق یہ ساری دنیا کی نعمتیں انسان کے لیے ہیں۔ اللہ ان سے روکتا نہیں ہے لیکن ان کی محبت دل میں بٹھانا تباہی ہے اور انعامات کا ملنا اور دل سے باہر رکھنا یہ نعمت ہے۔ (52)

(ر) دین کا مقصد اخلاقی بلندی

آپؒ کے مطابق جب معاشروں پر زوال آتا ہے تو ان میں سے اجتماعی انسانی سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام اور انسان دوستی لازم و ملزوم ہیں، اس بنا پر ایک مسلمان اگر بنیادی حقوق کے حوالے سے کُل انسانیت کی بجائے گروہی مفادات کو ترجیح دے تو اسے اپنے مسلمان ہونے پر از سر نو غور کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر آپؒ انسانیت کی بھلائی اور اجتماعی ترقی کی بات کرتے تھے اور اس حوالے سے یہ نظریہ رکھتے تھے کہ جو لوگ ظلم کے سرپرست اور دنیا پر ظلم کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں ان کا تعلق خواہ کسی دین اور مذہب سے ہو وہ انسانیت کی اجتماعی ترقی میں رکاوٹ اور کل انسانیت کے دشمن ہیں۔ آپ کے مطابق اللہ رب العزت اس انسان کو عزیز رکھتے ہیں جو مخلوق کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے، مخلوق کے ساتھ اس کو ہمدردی پیدا ہو جائے، مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ اس میں پیدا ہو جائے۔ گویا دینِ حق کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ کر خدا کا خوف پیدا کر کے انسان میں اخلاقی بلندی پیدا کرنا ہے تاکہ اس سے انسانیت دوستی ظاہر ہو۔ (53)

(س) غلبہ دین کی سوچ اور علمائے عصر کا طرزِ عمل

آپؒ کا ذہن فطری طور پر نمو پذیر اور تغیراتِ زمانہ کی رعایت کا حامل تھا۔ آپؒ حالاتِ زمانہ سے مکمل آگاہی رکھتے تھے اور قومی و بین الاقوامی حالات کے مدوجزر پر آپؒ کی گہری نظر تھی اور اس عمل نے آپؒ کو حقیقت پسندی و عملیت پسندی کے بہت قریب کر دیا تھا۔ اس حوالے سے آپؒ بعض علما کی پرانی سوچ اور عصری تقاضوں سے لاعلمی پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ:

> ''پچپن سال سے ہمارے اکثر علما اسی پرانی سوچ اور طریقہ پر اڑے ہوئے ہیں جو ہمارے بزرگوں نے انگریز کے دورِ غلامی میں عارضی طور پر مسلمانوں کو تحفظ دینے اور بچانے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد علماء کو مکمل دین کی تعلیم کے فروغ اور مکمل دین کے غلبہ کا راستہ اختیار کرنے اور اسی کی رہنمائی دینے کی ضرورت تھی

لیکن ہمارے علماء نے اس جامع سوچ کو نہ اپنایا اور اپنے آپ کو محض درس و تدریس تک محدود کر لیا۔'' (54)

آپؒ کے مطابق آج قومی سیاست سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی مفاد پرستی نے لوگوں میں لفظِ سیاست سے نفرت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جبکہ بین الاقوامی سیاست بھی ہمارے مفاد پرست سیاستدانوں کی وجہ سے ملکی حالات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان حالات میں مروجہ سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے قومی سطح پر تبدیلی کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ نظام کا حصہ بن کر نظام تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

(ص) فرقہ واریت اور گروہیت کی نفی

برصغیر کے تناظر میں اگر انسانیت دوستی کا جائزہ لیا جائے تو تمام ماہرین اس پر متفق ہیں کہ اس خطے میں اپنے نوآبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے انگریز نے فرقہ واریت، گروہیت اور فکری انتشار پیدا کیا۔ آپؒ کے مطابق اسلام انسانیت دوست دین ہے اور جب سے ہم نے انسانیت کی بجائے گروہی مفادات کی سوچ اپنائی ہے تب سے ہم اپنے حقیقی منصب سے محروم ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض سادہ لوح مگر جذباتی طبقات آج بھی انگریز سامراج کی اس پرانی چال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپؒ فرماتے تھے کہ:

''آج حنفی، توحیدی اور سنی ہونے کے اعتبار سے فرقہ واریت کا شدید تعصب محض جزوی تعصب ہے، جو باہمی اتحاد کا مظاہرہ کر کے دینی انقلاب تو کبھی پیدا نہیں ہونے دیتا لیکن یہی فرقہ پرست، بے دین ظالم سرمایہ دار طبقے کے اشاروں پر ضرور جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ، دہریہ جماعتوں اور شریعت کا مذاق اڑانے والوں کا ساتھ دے سکتے ہیں لیکن اپنی دینی جماعت سے مل کر نہیں چل سکتے۔'' (55)

(ط) عصری علوم کے حاملین کی تربیت

ہمارے مذہبی حلقوں میں عصری علوم کے حامل نوجوانوں کے حوالے سے یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ لادین اور بے دین ہیں۔ چناں چہ اگر کوئی نوجوان دین کی تفہیم کی غرض سے ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو ان کا پہلا حکم یہ ہوتا ہے کہ اپنا حلیہ تبدیل کر کے آؤ۔ اس عمل سے نوجوان میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن حضرتؒ کا طریقہ تربیت اس سے مختلف تھا، چناں چہ آپؒ نوجوانوں کے پاس خود چل کر جاتے اور انھیں پہلی ہی ملاقات میں ''جنید بغدادی'' بنانے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ تدریجی عمل کا خیال رکھتے ہوئے ان کے نفوس و قلوب پر محبت و شفقت کے ذریعے محنت کرتے اور ان میں دین کا صحیح فہم، اکابرین سے محبت اور عصری تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا فرماتے تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبد الودود علیمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''شیخ مکرم و معظم کا یہ طریقِ احسن رہا ہے کہ نوجوانوں کو وعیدیں سنا کر نہیں، بلکہ نویدوں اور بشارتوں سے ان کے قلوب و اذہان میں دین سے محبت پیدا فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طبقہ فکر و نظر کا نوجوان حضرت کی شفقت و محبت اور نظریات و خیالات سے متاثر نظر آتا ہے۔'' (56)

(ع) سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت

آپؒ سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف تھے۔ جو قومیں سرمایہ داریت کی آڑ میں دیگر اقوام کا استحصال کر رہی ہیں اور جو مذہبی نمائندے اس سرمایہ دارانہ نظام کو سندِ جواز فراہم کر رہے ہیں آپؒ انھیں انسانیت کا دشمن سمجھتے تھے۔ آپؒ سوشلزم کو بھی انسان کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کے حوالے سے نامکمل خیال کرتے تھے لیکن سرمایہ داریت پر ان کی تنقید بہت سخت ہے۔ مولانا عبد اللہ عابد سندھی لکھتے ہیں کہ:

''وہ سرمایہ داری نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے، بایں وجہ ان مذہبی مقتدر قوتوں کے بھی خلاف تھے جو سرمایہ دار اور سامراج کے آلہ کار بن کر غلبہ دین کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔''[57]

(ف) جدید علوم وفنون سے استفادہ

آپؒ کے نزدیک ترقیات کے حصول کے لیے جدید سائنسی علوم سے استفادہ ناگزیر ہے۔ نیز اس بنا پر ان علوم کی مخالفت کے یہ غیر مسلموں کے زیرِ اثر ہیں اس لیے ان کی تحصیل بھی غیر اسلامی ہے قطعاً درست نہیں۔ چناں چہ آج کے معروضی حالات میں دنیا کی قیادت و سیادت کے لیے ان علوم سے استفادہ میں کوئی قباحت نہیں۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ مغرب کی سائنسی ترقی کو سیکھا جائے لیکن ان کی تہذیب سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اس بات کا شعور پیدا کرنا ضروری ہوگا کہ جدید سائنسی ترقیات چوں کہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اس لیے انسانی فلاح کے عالمگیر اثرات مرتب نہیں ہو رہے۔[58] اسلام اور مغرب تعلقات کے حوالے سے آپؒ کی فکر یہ تھی کہ ہمیں ان کے علوم وفنون اور نظم ونسق جیسی خصوصیات اخذ کرنے کو خلافِ اسلام نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس حوالے سے آپؒ ''خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَرْ'' (اچھی چیز لے لو اور بُری چیز چھوڑ دو) کے اصول پر کاربند تھے۔ وہ مغرب کی تہذیب سے زیادہ اس کے ظالمانہ نظام کی مخالفت کرتے تھے۔

نتیجہ بحث

نتیجہ بحث یہ کہ مشائخ رائے پور نے اپنے دور کی روایتی خانقاہوں کے برعکس دینی، فکری اور شعوری میدان میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس خانقاہ کو جہاں اہلِ حق علماء کی تائید اور سرپرستی حاصل رہی، وہیں اس خانقاہ نے اپنے دور کی اہم تحریکات کی سرپرستی بھی کی اور ان تحریکات کو سامراج کے ہاتھوں استعمال ہونے سے روکے رکھا۔ اس خانقاہ کے مشائخ نے انفرادیت پسندی کی سوچ کی نفی کرتے ہوئے اجتماعی اصلاحی رجحانات کو فروغ دیا۔ نیز فرقہ واریت اور مذہب کو گروہی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی نفی کی۔ اس خانقاہ کے مشائخ نے سرمایہ دارانہ سوچ کی سخت مذمت کی اور خود کو محض روحانیت تک محدود رکھنے کی بجائے اسلام کے حقیقی معاشی نظام کو بھی اجاگر کیا۔ تقسیم کے عمل کے بعد اس خانقاہ نے اپنا سیاسی وتحریکی کردار بھی جاری رکھا۔ چناں چہ اس خانقاہ کے بزرگ مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ نے اس خطے میں دینی فکر کے فروغ اور عملی تشکیل کے حوالے سے مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی مکمل تربیت فرما کر مستقبل میں کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا، جنہوں نے تقسیم کے بعد کے حالات میں جبکہ نئی نسل دینی فکر اور اس فکر کی حامل جماعت کی جدوجہد سے ناآشنا ہوتی جا رہی تھی، اس فکر کو مکمل ایمان داری سے نئی نسل میں منتقل کیا

اور انہیں اپنی تاریخ کے حقیقی کرداروں سے متعارف کرایا۔ انھوں نے اس خطے کی نوجوان نسل کو اپنی فکر کا موضوع بناتے ہوئے دین کے جامع فلسفے کے تناظر میں ان کی تربیت فرمائی۔ یہ بات درست ہے کہ غلبہ دین کے قدیم روایتی تصورات کے برعکس اپنے جدید رجحانات اور تصورات کے باعث اس خانقاہ کے بعض مشائخ پر قدامت پسند مذہبی طبقے کی طرف سے بعض اختلافات بھی سامنے آئے، لیکن یہ ایک فطری عمل ہے جس کا سامنا ہر تجدد پسند طبقے کو کرنا پڑا ہے۔ اختلاف کرنے والے حضرات کا بنیادی اور کلیدی اختلاف یہ ہے کہ دین اور سیاست دو الگ شعبے ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ تاہم اس خانقاہ کے مشائخ برصغیر کی سیاسی تحریکات کا ایک طویل پس منظر رکھتے ہیں اور غلبہ دین کے لیے سیاسی فہم وشعور کو بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان حضرات کا ماننا ہے کہ شرعی اور روحانی نظام کو غالب کرنے کے لیے سیاسی نظام کا ہاتھ میں ہونا بہت ضروری ہے، اس لیے کہ تہذیب وتمدن بھی اسی قوم کا غالب ہوگا جس کا سیاسی نظام غالب ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خانقاہ کے مشائخ کے ''فلسفہ جامعیتِ دین'' کو اجاگر کیا جائے تاکہ سوسائٹی میں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامع فکر تشکیل پائے۔ یقیناً اس عمل سے جہاں خانقاہی نظام کے حقیقی فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہیں دین کے عصری اور سماجی تقاضوں کا شعور بھی حاصل ہوگا، جس کی ہمارے سماج کو سخت ضرورت ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ سوانح حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، تصنیف: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، ص: 90، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور۔

2۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ایک طرف تو دارالعلوم کا مدرسہ اس خطے کی استعماری قوتوں کے خلاف آزادی کے لیے مصروفِ عمل تھا تو دوسری طرف گنگوہ، سہارن پور اور رائے پور کی خانقاہیں بھی تعمیر باطن کا کام کر رہی تھیں۔ مولانا انظر شاہ (فرزند علامہ انور شاہ کشمیری) لکھتے ہیں کہ ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ آزادی وطن تک ان (خانقاہوں) میں خفیہ ''بیعت جہاد'' بھی لی جاتی تھی۔ (ان خانقاہوں کا مقصد) برٹش اقتدار کے خلاف ان جذبات پر مبنی تھا کہ تخت یا تختہ۔ تفصیل ملاحظہ ہو: مسعودی، انظر شاہ، نقشِ دوام، دیوبند، مطبع دیوبند، س۔ن، ص 206۔

3۔ آزاد، عبدالخالق، سوانح شاہ عبدالرحیم رائے پوری، سہارن پور، کتب خانہ یحیوی، 2010ء ص 211۔

4۔ سہ ماہی شعور وآگہی، ج 5، شمارہ 1، ص 8، جنوری۔ مارچ 2013ء، لاہور۔

5۔ آپ کا آبائی قصبہ گمتھلہ ضلع کرنال ہے، گمتھلہ کو آج سے تقریباً ساڑھے سات سو سال پہلے چوہان راجپوت قوم کے ایک فرد بھیم چندرم نے آباد کیا تھا۔ ''گمتھلہ'' اصل میں ''گن تھلہ'' تھا، سنسکرت میں ''گن'' علم کی اساس پر روحانی گیان ودھیان کے لیے استعمال ہوتا ہے ''تھلہ'' اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ گویا ''گن تھلہ'' کا مطلب ہوا ''گیان ودھیان کی بلند جگہ''۔ کثرت استعمال سے ''گن تھلہ'' تبدیل ہو کر ''گمتھلہ'' ہوگیا۔ اس کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقام علمی وروحانی اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔

6۔ خاندانی طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ ''بابا طاہر خاں'' حضرت شرف الدین بوعلی قلندر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ تاہم یہ روایت درست

نہیں ہے۔ کیوں کہ بوعلی قلندر کا زمانہ (۶۰۴ھ/ 1208ء تا ۷۲۴ھ/ 1324ء) سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق تک کا عہد ہے جبکہ اس خاندان کے قلمی شجرہ نسب میں ''طاہر خاں'' کے مسلمان ہونے کا زمانہ (۹۶۳ھ/ 1556ء تا ۱۰۱۴ھ/ 1605ء) شہنشاہ اکبر کا زمانہ ہے۔ اس لیے درست یہ ہے کہ وہ بوعلی قلندر کے سلسلہ کے کسی بزرگ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

7۔ میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید،، لاہور، مکتبہ مدنیہ، 1406ھ، ج 2، ص 155۔

8۔ آپؒ کے اساتذہ میں مولانا مظہر نانوتویؒ اور مولانا احمد علی سہارن پوریؒ ایسے حضرات شامل تھے، جو ولی اللّٰہی جماعت کے انتہائی اہم افراد تھے۔

9۔ میاں عبدالرحیم سہارن پوری کے مربی اور شیخ حضرت اخوند عبدالغفور سواتی نے انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ آپ ہی کی کوششوں سے سوات و بنیر میں قبائل کی آزاد ریاست قائم ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی نے نزہتہ الخواطر میں آپ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔

10۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن (مرتب)، ارشادات (مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری)،، لاہور، سید احمد شہید اکیڈمی، 2006ء، ص 253۔

11۔ سہ ماہی شعور و آگہی، ج 5، شمارہ 1، ص 19، جنوری۔ مارچ 2013ء، لاہور۔

12۔ میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، سیالکوٹ، مکتبہ قاسمیہ، 1969ء، ص 246-245۔

13۔ سہ ماہی شعور و آگہی، ج 5، شمارہ 10، ص 42، جنوری۔ مارچ 2013ء، لاہور۔

14۔ میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، ص 240۔

15۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۳۲۷ھ/ 1909ء میں ''جمعیۃ الانصارؒ'' قائم کی اور مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا احمد امروہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جمع کر کے زمانے کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں اور انہیں اس کام میں معاونت کا کہا۔ مولانا تھانویؒ نے تو معذرت فرمالی البتہ باقی حضرات نے موافقت کی۔ مولانا سندھیؒ نے ''جمعیۃ الانصار'' کو قدیم طلبا کی تنظیم سے آگے بڑھا کر اس میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی شامل کیا اور یقیناً یہ عمل انھوں نے شیخ الہندؒ کے حکم پر کیا تھا۔ تاہم دارالعلوم کے اندرونی حالات مولانا محمد احمد (فرزند مولانا نانوتوی و مہتمم دارالعلوم) کے اہتمام میں کافی تبدیل ہو چکے تھے جو دارالعلوم کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اربابِ مدرسہ کو حضرت شیخ الہندؒ کی قائم کردہ ''جمعیۃ الانصار'' ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر شیخ الہندؒ نے باہمی محاذ آرائی سے بچنے کی خاطر ''جمعیۃ الانصار'' کا مرکز تبدیل کر کے دہلی منتقل کر دیا اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ۱۳۳۱ھ/ 1913ء میں دہلی میں مولانا سندھیؒ ہی کی نظامت میں اس نے کام شروع کیا، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرنا اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر و فلسفہ کے مطابق ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی رہنمائی کرنا تھا۔

16۔ محبوب رضوی، تاریخِ دارالعلوم دیوبند، لاہور، المیز ان ناشران و تاجران کتب، 2005ء، ج 1، ص 207۔

17۔ محمد زکریا، مولانا، تاریخ مظاہر العلوم، سہارن پور، کتب خانہ اشاعت العلوم، 1392ھ، ج 1، ص 90۔

18۔ حضرت گنگوہیؒ کے انتقال (۱۳۲۳ھ/ 1905ء) کے بعد خانقاہِ گنگوہ سے وابستہ تمام ادارے، تحریکات اور مراکز کی رہنمائی اور سرپرستی آپؒ کے سپرد ہوگئی۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت نانوتویؒ کے وصال (۱۲۹۸ھ/ 1880ء) کے بعد اساتذہ میں جو فکری تقسیم ہوئی تھی اس نے اس ادارے کے فاضلین کو بھی فکری و تربیتی اعتبار سے تقسیم کر دیا تھا۔ چناں چہ شاہ ولی اللہ کی سیاسی فکر اور فہم و شعور کا حامل طبقہ اپنی تربیت کو موثر بنانے کے لیے عام طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے سے ''خانقاہِ رائے پور'' کا رخ کرتے تھے جبکہ غیر سیاسی اور غیر تحریکی مزاج کا حامل طبقہ ''خانقاہِ تھانہ بھون'' کا رخ کرتا تھا۔

19۔ سہ ماہی شعور وآ گہی، ج 5، شمارہ 2، ص 9، اپریل۔ جون 2013ء، لاہور۔
20۔ مدنی، حسین احمد، نقش حیات، کراچی، دارالاشاعت، س۔ ن، ج 2، ص 624۔
21۔ محمد میاں، سید، ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا ہے؟، دہلی، الجمعیۃ بک ڈپو، س۔ ن، ص 80۔ شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد جب آپ سے اس تحریک کی بابت انگریز نے سوال وجواب کیا تو آپؒ نے برملا اپنی شرکت اور اس تحریک کی سرپرستی کا اظہار کرتے ہوئے عزیمت کی راہ اختیار کی۔
22۔ ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص 31۔
23۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن (مرتب)، مجالس حضرت رائے پوری، لاہور، مکتبہ سید احمد شہید، 1996ء، ص 37۔
24۔ قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالات زندگی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، کراچی، ادارۃ المعارف، 2009ء، ص 35۔
25۔ ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص 51۔
26۔ قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالاتِ زندگی، ص 70-69۔
27۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن، ارشادات (مقدمہ)، ص 35۔
28۔ ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص 220۔
29۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن، مجالس حضرت رائے پوری، ص 125۔
30۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن، ارشادات، ص 129۔
31۔ مرجع سابق، ص 181۔
32۔ رائے پوری، حبیب الرحمٰن، ارشادات، ص 75۔
33۔ عبدالرشید ارشد، برصغیر پاک و ہند کے بیس بڑے مسلمان، لاہور، مکتبہ رشیدیہ، 1969ء، ص 609۔
34۔ آزاد، عبدالخالق، مشائخ رائے پور، لاہور، دارالتحقیق والاشاعت، 2006ء، ص 77۔
35۔ ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص 279۔
36۔ مرجع سابق، ص 279۔
37۔ قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالاتِ زندگی، ص 179۔
38۔ آپ کا نام ''عبدالعزیز'' بھی حضرت گنگوہیؒ کے ایماء پر حضرت عالی رائے پوریؒ نے تجویز فرمایا۔ گمان یہ ہے کہ نام کی یہ نسبت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو: آزاد، عبدالخالق، مشائخ رائے پور، ص 118-117۔
39۔ ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص 205۔
40۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 120)، ص 17، مئی۔ جون 1993ء، ملتان۔
41۔ آپؒ نے ڈاکٹر محمود الحسن عارف (سابق مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ) کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اس غلط قانون کے خلاف مواد اکٹھا کریں اور قانونی میدان میں اس کی جنگ لڑیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو: مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 112)، ص 16، جولائی۔ اگست 1992ء، ملتان
42۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 120)، ص 16، مئی۔ جون 1993ء، ملتان۔
43۔ عزیمت (سیریز نمبر: 9)، ص 16-15، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن۔
44۔ آپؒ کی نوجوانوں سے محبت وشفقت کے حوالے سے ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ کی یوں تو ہر ادا پسندیدہ تھی، مگر میں نے خصوصیت سے یہ بات نوٹ کی کہ وہ نوجوانوں پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتے تھے، ان کے ہر ہر عمل پر پوری نظر

تھی۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرسکتا ہے...... میں اس زمانے میں داڑھی نہیں رکھتا تھا، اس بنیاد پر انھوں نے نہ مجھ پر فاسق وفاجر کا حکم لگایا، نہ دھتکارا اور نہ ہی مجھ سے کنارہ کش رہے بلکہ اس کے برعکس بہت محبت سے ملے۔ ملاحظہ ہو: عزیمت (سیریز نمبر: 9)، ص 17، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن۔

45۔ آزاد، عبد الخالق، مشائخ رائے پور، ص 179۔

46۔ روایت حضرت رائے پوری رابع مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ۔ سہ ماہی شعور و آگہی، ج 4، شمارہ 4، ص 34، اکتوبر۔ دسمبر 2012ء، لاہور۔

47۔ مولانا بشیر احمد امینی لکھتے ہیں کہ حضرت رائے پوری ثانیؒ زیارت کے لیے آنے والے علماء سے فرماتے کہ اس نوجوان (شاہ سعید احمد رائے پوری) کی باتیں غور سے سنو۔ آپ اپنے شیخ کی موجودگی میں دین اسلام کے عصری تقاضوں پر گفتگو فرماتے۔ ملاحظہ ہو: امینی، بشیر احمد، مولانا، فیضان مشائخ رائے پور، ص 173۔

48۔ سہ ماہی شعور و آگہی، ج 4، شمارہ 4، ص 34، اکتوبر۔ دسمبر 2012ء، لاہور۔

49۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 94-93)، ص 24، ستمبر۔ اکتوبر 1990ء، ملتان۔

50۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 46)، ص 9، جولائی 1982ء، لاہور۔

51۔ مرجع سابق، ص 10۔

52۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 162)، ص 17-16، جنوری۔ فروری 1998ء، ملتان۔

53۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 262)، ص 6، ستمبر 2012ء، ملتان۔

54۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 249)، ص 13، نومبر۔ دسمبر 2010ء، ملتان۔

55۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 38)، ص 9، جولائی 1981ء، ملتان۔

56۔ پروفیسر محمد عبد الودود علیمی کا یہ مکتوب گرامی (7 مارچ 2010) شعور و آگہی، اپریل۔ جون 2010ء، ج 2، شمارہ 2، ص 119 میں شائع ہوا تھا۔

57۔ مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 265)، ص 9، جنوری۔ مارچ 2013ء، ملتان۔

58۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ آج دنیا میں صرف علم کی بنیاد پر ترقیات ہورہی ہیں۔ سائنسی ترقیات کے منصوبے بنتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں اتنی ترقی ہونے کے باوجود عام آدمی خوش حال کیوں نہیں ہے......صرف علم اگر نور ہے تو پھر اس کی روشنی عام کیوں نہیں ہوتی؟ میری اس بات پر آج کا نوجوان فوراً سوال کرے گا کہ آپ علم کے مخالف ہیں؟ ترقیات نہیں چاہتے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ میں تو آپ کو سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ اسلام کے ظہور سے پہلے جب پوری دنیا میں استحصالی نظام تھا کیا اس وقت ان کے پاس علم نہیں تھا؟...... ہم نوجوانوں کے لیے ترقیات کے دروازے کھولنا چاہتے ہیں۔ ہم نوجوانوں کے علم کو روشنی دینا چاہتے ہیں۔ ہم ان میں قومی سوچ اور قیادت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: مجلّہ عزم (سیریز نمبر: 134)، ص 8-7، اکتوبر 1994ء، ملتان۔

☆

www.rahimia.org

تاریخ و سیاست

پاکستان کا یومِ آزادی کیا ہے؟

(14/ یا 15/ اگست 1947ء)

تحریر: عقیل عباس جعفری

پاکستان کو آزاد ہوئے 72 برس گزر گئے، مگر ان 72 برسوں میں ہم اپنی تاریخ کے کتنے ہی گوشوں سے ناواقف رہے۔ ہم اپنے یومِ آزادی کی تقریبات ہر سال 14/ اگست کو اور ہمارے ساتھ آزاد ہونے والا ہمسایہ ملک بھارت اپنی یہی تقریبات 15/ اگست کو مناتا ہے۔ ہر سال یہ سوال اٹھتا ہے کہ دو ملک، جو ایک ساتھ آزاد ہوئے ہوں، ان کے یومِ آزادی میں ایک دن کا فرق کیسے آ گیا؟ اپنے اس مضمون میں ہم نے اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے بزرگ ہمیں بتاتے ہیں کہ پاکستان رمضان کی 27 ویں شب کو قائم ہوا اور یہ کہ جس دن پاکستان قائم ہوا، اس دن جمعۃ الوداع کا مبارک دن تھا۔ پھر ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس دن 14/ اگست 1947ء کی تاریخ تھی۔ ہم اپنے ساتھ آزاد ہونے والے ملک سے ایک ''دن بڑے'' ہیں۔ جب ہم 14/ اگست 1947ء کی تقویم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دن جمعرات تھی اور ہجری تاریخ بھی 27/ نہیں، 26/ رمضان تھی۔ پھر ہم پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ دیکھتے ہیں، جو پاکستان کی آزادی کے 11 ماہ بعد 09/ جولائی 1948ء کو جاری ہوئے تھے۔ ان ڈاک ٹکٹوں پر واضح طور پر پاکستان کا یومِ آزادی 15/ اگست 1947ء طبع ہوا ہے۔ چناں چہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کا یومِ آزادی بھی 14/ نہیں، بلکہ 15/ اگست ہے، مگر پھر یومِ آزادی کی پہلی سال گرہ 14/ اگست کو کیوں منائی گئی؟ یوں ذہن ایک مرتبہ پھر اُلجھ جاتا ہے کہ پاکستان آزاد کب ہوا تھا۔ 14/ اگست 1947ء کو یا 15/ اگست 1947ء کو....

اگر ہم 14/ اگست 1947ء کو آزاد ہوئے تو آزادی کے گیارہ ماہ بعد شائع ہونے والے ڈاک ٹکٹوں پر یومِ آزادی کی تاریخ 15/ اگست 1947ء کیوں طبع ہوئی اور اگر پاکستان 15/ اگست 1947ء کو آزاد ہوا تو ہم نے آزادی کی پہلی سال گرہ 15/ کے بجائے 14/ اگست کو کیوں منائی؟ اور آج تک یہ سال گرہ 15/ کے بجائے 14/ اگست کو کیوں مناتے چلے آ رہے ہیں؟

آج ہم اپنے اس مضمون میں اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم دستاویز Indian Independence Act 1947 ہے، جسے برطانوی پارلیمان نے منظور کیا اور جس کی توثیق شہنشاہِ برطانیہ جارج ششم نے 18/ جولائی 1947ء کو کی۔ اس قانون کی ایک نقل پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی نے (جو بعد ازاں پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے) 24/ جولائی 1947ء کو قائدِ اعظم کو ارسال کی۔

یہ قانون 1983ء میں حکومتِ برطانیہ کی شائع کردہ دستاویز The Transfer of Power کی جلد 12 کے صفحہ 234 پر اور

اس کا ترجمہ قائدِاعظم پیپرز پروجیکٹ، کیبنٹ ڈویژن حکومتِ پاکستان اسلام آباد کے شائع کردہ جناح پیپرز (کے اردو ترجمے) کی جلدسوم کے صفحہ 45 سے 72 تک ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون میں واضح طور پر درج ہے:

(1) 15/ اگست 1947ء سے برطانوی ہندوستان میں دو آزاد فرماں روا مملکتیں قائم کی جائیں گے، جو بالترتیب ''انڈیا'' اور ''پاکستان'' کے نام سے موسوم ہوں گی۔

(2) بعدازاں اس قانون میں ''ان مملکتوں سے مطلب نئی مملکتیں اور ''مقررہ دن'' سے مراد 15/ اگست کی تاریخ ہوگی۔

ٹرانسفر آف پاور جلد 12 کے صفحہ 234 پر اصل تحریر کچھ یوں ہے:

"Indian Independence Act, 1947

1.(1) As from the fifteenth day of August, nineteen hundred and forty seven, two independent Dominions shall be set up in India, to be known respectively as India and Pakistan.

(2) The said Dominions are hereafter in the Act referred to as "the new Dominions", and said fifteenth day of August is hereafter in this Act referred to as "the appointed day".

اس قانون کے تسلسل میں جاری ہونے والے چند اور احکامات ملاحظہ ہوں، جن کے اقتباسات اور ترجمہ ضیاء الدین لاہوری نے اپنے مضمون ''یومِ آزادی: جمعۃ المبارک 27/ رمضان یا 15/ اگست'' مشمولہ جریدہ 36- شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی میں شامل کیا ہے۔

☆ 07/ اگست 1947ء: اقوامِ متحدہ میں برطانیہ کے مستقل نمائندے کے نام دفترِ خارجہ کا تار:

''اب وائسرائے نے تار بھیجا ہے کہ مسلمان قائدین اقوامِ متحدہ کی رُکنیت کے لیے درخواست دینے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ برطانیہ فوری طور پر پاکستان کی طرف سے درخواست دائر کرے اور جب پاکستان 15/ اگست کو ایک آزاد مملکت بن جائے گا، تو وہ اس کی توثیق براہِ راست خود کرے گا۔'' (صفحہ: 570)

☆ 12/ اگست 1947ء: (ہندوستان اور پاکستان کی رُکنیت کے استحقاق پر سیکریٹریٹ اقوامِ متحدہ کے میمورنڈم کی پریس ریلیز سے ایک اقتباس)

''قانون آزادیٔ ہند قرار دیتا ہے کہ اگست 1947ء کی 15/ تاریخ کو ہندوستان میں دو آزاد مملکتیں بالترتیب ہندوستان اور پاکستان کے نام سے قائم ہوں گی۔'' (صفحہ: 385)

حکومتِ برطانیہ نے یہ اعلان تو کردیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک ہی وقت یعنی 15/ اگست 1947ء کو صفر ساعت پر آزاد ہوں گے، مگر مسئلہ یہ ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو 14/ اور 15/ اگست 1947ء کی درمیانی شب نئی دہلی میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرنا تھا۔ اور خود آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنا تھا۔

مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن 13/ اگست 1947ء کو کراچی تشریف لائیں اور 14/ اگست 1947ء کی صبح پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے انتقالِ اقتدار کی کاروائی مکمل کریں اور یہ اعلان کریں کہ اس رات یعنی 14/

اور 15 / اگست 1947ء کی درمیانی شب پاکستان ایک آزاد مملکت بن جائے گا۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ 13 / اگست 1947ء لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی تشریف لے آئے اور اسی رات کراچی کے گورنر جنرل ہاؤس میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ جس سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

''میں ملک معظم کی صحت کا جام تجویز کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک نہایت اہم اور منفرد موقع ہے۔ آج ہندوستان کے لوگوں کو مکمل اقتدار منتقل ہونے والا ہے اور 15 / اگست 1947ء کے مقررہ دن دو آزاد اور خود مختار مملکتیں پاکستان اور ہندوستان وجود میں آ جائیں گی۔ ملک معظم کی حکومت کے اس فیصلے سے وہ اعلیٰ و ارفع نصب العین حاصل ہو جائے گیا، جو دولتِ مشترکہ کے قیام کا واحد مقصد قرار دیا گیا تھا۔''

اگلے روز جمعرات 14 / اگست 1947ء مطابق ۲۶ / رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کی صبح 09 بجے موجودہ سندھ اسمبلی بلڈنگ میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا خصوصی اجلاس شروع ہوا۔

صبح سے ہی عمارت کے سامنے پُر جوش عوام جمع تھے۔ جب پاکستان کے نام زد گورنر جنرل قائدِ اعظم محمد علی جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک مخصوص بگھی میں سوار اسمبلی ہال پہنچے تو عوام نے پُر جوش نعروں اور تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اسمبلی کی تمام نشستیں پُر تھیں۔ گیلری میں ممتاز شہریوں، سیاست دانوں اور ملکی اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ کرسئ صدارت پر دستور ساز اسمبلی کے صدر قائدِ اعظم محمد علی جناح تشریف فرما تھے اور ان کے برابر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نشست تھی۔ دونوں اکابر نے جب اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں تو کارروائی کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔

سب سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہِ انگلستان کا پیغام پڑھ کر سنایا، جس میں قائدِ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

''برطانوی دولتِ مشترکہ کی اقوام کی صف میں شامل ہونے والی نئی ریاست کے قیام کے عظیم موقع پر میں آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح آزادی حاصل کی ہے، وہ ساری دنیا کے حریت پسند عوام کے لیے ایک مثال ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ برطانوی دولتِ مشترکہ کے تمام ارکان جمہوری اصولوں کو سر بلند رکھنے میں آپ کا ساتھ دیں گے۔''

اس پیغام کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الوداعی تقریر کی اور پاکستان اور پاکستانی عوام کی سلامتی کے لیے دعا مانگی۔

اپنی اس تقریر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واضح الفاظ میں کہا:

''آج میں آپ سے آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں۔ کل نئی ڈومنین پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومنین آف انڈیا کا آئینی سربراہ بنوں گا۔ دونوں حکومتوں کے قائدین نے مجھے جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا غیر جانب دار چیئرمین بننے کی دعوت دی ہے۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے، جس پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔

کل دو نئی خود مختار ریاستیں دولتِ مشترکہ میں شامل ہوں گی۔ یہ نئی اقوام نہ ہوں گی، بلکہ یہ قدیم قابل فخر تمدن کی وارث اقوام ہیں۔ ان مکمل طور پر آزاد ریاستوں کے لیڈر بڑے مدبر ہیں، دنیا بھر کی نگاہوں میں احترام سے دیکھے

جاتے ہیں۔ ان کے شاعروں، فلسفہ دانوں، سائنس دانوں اور افواج نے انسانیت کی خدمت کے لیے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان ریاستوں کی حکومتیں ناتجربہ کار اور کمزور نہیں ہیں، بلکہ دنیا بھر میں قیامِ امن اور ترقی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔''

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے شاہِ انگلستان اور وائسرائے کا شکریہ ادا کیا اور انھیں یقین دلایا کہ:

''ہمارا ہمسایوں سے بہتر اور دوستانہ تعلقات کا جذبہ کبھی کم نہ ہوگا اور ہم ساری دنیا کے دوست رہیں گے۔''

اسمبلی کی کارروائی اور اعلانِ آزادی کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ شاہی بگھی میں گورنر جنرل ہاؤس واپس ہوئے۔ دوپہر دو بجے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئی دہلی روانہ ہوگئے، جہاں اسی رات 12 بجے بھارت کی آزادی کے اعلان کے ساتھ انھیں بھارت کا گورنر جنرل کا منصب سنبھالنا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلانِ آزادی کے مطابق 14/اور 15/اگست 1947ء کی درمیانی شب رات 12 بجے دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خودمختار اور دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مملکت کا اضافہ ہوا، جس کا نام ''پاکستان'' تھا۔

عین اسی وقت لاہور، پشاور اور ڈھاکہ سے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس سے پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اس سے قبل 14/اور 15/اگست 1947ء کی درمیانی رات لاہور، پشاور اور ڈھاکہ کے اسٹیشنوں سے رات 11 بجے آل انڈیا ریڈیو سروس نے اپنا آخری اعلان نشر کیا۔ 12 بجے سے کچھ لمحے پہلے ریڈیو پاکستان کی شناختی دُھن بجائی گئی اور ظہور آذر کی آواز میں انگریزی زبان میں فضا میں ایک اعلان گونجا کہ آدھی رات کے وقت پاکستان کی آزاد اور خودمختار مملکت معرضِ وجود میں آجائے گی۔ رات کے ٹھیک 12 بجے ہزاروں سامعین کے کانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اُردو میں یہ الفاظ گونجے:

''یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے''۔

انگریزی میں یہ اعلان ظہور آذر نے اور اُردو میں مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد مولانا ظاہرالقاسمی نے قرآن مجید کی سورہ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں، جس کے بعد ان کا ترجمہ نشر کیا گیا۔ بعدازاں خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا ایک خصوصی سازینہ بجایا گیا۔ پھر سنتو خاں اور ان کے ہم نواؤں نے قوالی میں علامہ اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' کے چند بند پیش کیے۔ ان نشریات کا اختتام حفیظ ہوشیارپوری کی ایک تقریر پر ہوا۔ آدھی رات کے وقت ہی ریڈیو پاکستان پشاور سے آفتاب احمد بسمل نے اردو میں اور عبداللہ جان مغموم نے پشتو میں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا، جب کہ قرآن پاک کی تلاوت کا شرف قاری فدامحمد نے حاصل کیا۔ ان نشریات کا اختتام جناب احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے ایک نغمے پر ہوا، جس کے بول تھے: ''پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو''۔ اسی وقت اسی نوعیت کا اعلان ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے انگریزی میں کلیم اللہ نے کیا، جس کا ترجمہ بنگلہ زبان میں نشر کیا گیا۔

15/اگست 1947ء کی صبح ریڈیو پاکستان لاہور کی ٹرانسمیشن کا آغاز آٹھ بجے سورۂ آلِ عمران کی منتخب آیات سے ہوا۔ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے بعد انگریزی خبروں کا آغاز ہوا، جو نیوز ریڈر نوبی (Nobby) نے پڑھیں۔ خبروں کے بعد ٹھیک

ساڑھے آٹھ بجے قائدِاعظم کی آواز میں ایک پیغام سنوایا گیا، جو ریکارڈ شدہ تھا (قائدِاعظم کے خطاب کی آڈیو کلپ یوٹیوب پر موجود ہے) قائدِاعظم کی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا:

"It is with feelings of greatest happiness and emotion that send you my greetings. August 15 is the birthday of independent and sovereign state of Pakistan. It marks the fulfillment of the destiny of the Muslim nation which made great sacrifices in the past few years to have its homeland."

(ترجمہ: بے پایاں مسرت اور احساس کے جذبات کے ساتھ میں آپ کو تہنیت کا پیغام دیتا ہوں۔ 15/اگست آزاد اور خودمختار پاکستان کی پیدائش کا دن ہے۔ یہ مسلم قوم کی منزلِ مقصود کی علامت ہے، جس نے پچھلے چند برسوں میں اپنے وطن کے حصول کے لیے عظیم قربانیاں پیش کیں۔)

اپنے اس خطاب میں قائدِاعظم نے پاکستان کے تمام شہریوں کو پاکستان کی خودمختار مملکت کے قیام کی مبارک باد پیش کی۔ اور کہا کہ: ''اس نئی مملکت کے وجود میں آجانے سے پاکستان کے باشندوں پر زبردست ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اب انھیں دنیا کو یہ ثابت کر دکھانا چاہیے کہ کس طرح ایک قوم، جس میں مختلف عناصر شامل ہیں، آپس میں مل جل کر صلح و آشتی کے ساتھ رہتی ہے''۔

اسی دن، یعنی 15/اگست 1947ء کی صبح کے اخبارات نے پاکستان کے یومِ آزادی کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع کیے۔ اور انگریزی کے مشہور اخبار ''ڈان'' نے کراچی سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس خصوصی اشاعت کی سرخی تھی: "May Pakistan Prosper Always" :Lord Mountbatten"۔ اس سرخی کے نیچے جو خبر شائع ہوئی تھی، اس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس تقریر کا مکمل متن درج کیا گیا تھا، جس کا اقتباس اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ روزنامہ ڈان نے اس موقع پر 32 صفحات پر مشتمل ایک خصوصی ضمیمہ بھی شائع کیا تھا، جو ہمارے ذاتی کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ اور یوٹیوب پر بھی Dawn15/8/1947 لکھ کر تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ڈان کے اس ضمیمے میں قائدِاعظم محمد علی جناح کا ایک پیغام بھی شامل تھا، جو 10- اورنگ زیب روڈ، نئی دہلی سے جاری کیا گیا تھا۔ اس پیغام پر اس کے اجرا کی تاریخ درج نہیں ہے، مگر یہ بات یقینی ہے کہ یہ پیغام 07/اگست 1947ء سے پہلے جاری ہوا تھا۔ اس پیغام میں قائدِاعظم محمد علی جناح نے کہا:

"The first issue, I am informed will appear from Karachi, the capital of Pakistan on the 15th of August, the appointed day."

(مجھے بتایا گیا ہے کہ (روزنامہ ڈان کا) پہلا شمارہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی سے 15/اگست کو، جو مقررہ دن ہے، شائع کیا جائے گا۔)

اسی دن یعنی 15/اگست کو پاکستان کا پہلا گزٹ بھی جاری ہوا، جس میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی بطورِ گورنر جنرل پاکستان مقرر کیے جانے اور اسی دن سے ان کا یہ عہدہ سنبھالنے کی اطلاع درج تھی۔ اسی روز لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس

عبدالرشید نے قائدِاعظم محمد علی جناح سے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور اسی روز نواب زادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی کابینہ کے ارکان نے بھی اپنے عہدوں کے حلف اٹھا لیے۔

ان تمام معروضات اور دستاویزی شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پاکستان 14/اگست 1947ء کو نہیں، بلکہ 15/اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے پہلے برس کسی کو اس معاملے میں ابہام نہیں تھا کہ پاکستان کب آزاد ہوا۔ اس بات کو تقویت اس چیز سے بھی ملتی ہے کہ 19/دسمبر 1947ء کو پاکستان کے محکمہ داخلہ نے اپنے مراسلے 17/47 کے ذریعے 1948ء کی جن سالانہ تعطیلات کا اعلان کیا، ان میں 1948ء کے لیے یومِ پاکستان کی تعطیل کے آگے 15/اگست 1948ء کی تاریخ درج تھی۔

1948ء کی پہلی سہ ماہی میں پاکستان کے محکمہ ڈاک نے پاکستان کے ابتدائی ڈاک ٹکٹوں کی ڈیزائننگ اور طباعت کے کام کا آغاز کیا۔ یہ چار ڈاک ٹکٹوں کا سیٹ تھا، جن کے ابتدائی تین ڈاک ٹکٹ ایکسٹرنل پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے مصوروں رشیدالدین اور محمد لطیف نے مشترکہ طور پر ڈیزائن کیے تھے۔ جب کہ چوتھا ڈاک ٹکٹ اور اس کے ساتھ شائع ہونے والا فولڈر ملک کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی تخلیق تھا۔ یہ ڈاک ٹکٹ برطانیہ کے طباعتی ادارے میسرز ٹامس ڈی لا رو میں طبع ہوئے تھے۔ یہ ڈاک ٹکٹ 09/جولائی 1948ء کو فروخت کے لیے پیش کیے گئے اور ان پر بھی پاکستان کے یومِ آزادی کی تاریخ 15/اگست 1947ء شائع کی گئی تھی۔ گویا جس وقت یہ ڈاک ٹکٹ ڈیزائن ہوئے اور اشاعت کے لیے برطانیہ بھیجے گئے اس وقت تک یہ بات طے تھی کہ پاکستان 15/اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔

پاکستان کا یومِ آزادی 15/ سے 14/اگست کب ہوا، یہ معمہ حل کرنے کے لیے ہم نے نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کیبنٹ ڈویژن، اسلام آباد کے دروازے پر دستک دی۔ وہاں ہماری ملاقات اس سینٹر کے ڈائریکٹر جناب قمرالزماں سے ہوئی، جن کی مدد سے ہماری رسائی اس سینٹر میں محفوظ ان فائلوں تک ہوئی، جو ایک طویل عرصے تک خفیہ رہنے کے بعد اب عوام کے لیے کھول دی گئی ہیں۔

ان فائلوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ منگل 29/جون 1948ء کو کراچی میں وزیرِاعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی زیرِصدارت منعقد ہونے والے کابینہ کے ایک اجلاس میں، جس میں وزیرِ خارجہ، وزیرِ مواصلات، قانون و محنت، وزیرِ مہاجرین و آبادکاری، وزیرِ خوراک، زراعت و صحت اور وزیرِ داخلہ، اطلاعات و نشریات موجود تھے، فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے یومِ آزادی کی تقریبات 15/اگست 1948ء کے بجائے 14/اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیرِاعظم لیاقت علی نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ حتمی نہیں ہے، وہ یہ معاملہ قائدِاعظم محمد علی جناح کے علم میں لائیں گے اور جو بھی حتمی فیصلہ ہوگا، قائدِاعظم کی منظوری کے بعد ہوگا۔

وہ فائل، جس میں یہ تفصیل درج ہے، اس کا نمبر ہے: 196/CF/48 اور کیس کا نمبر ہے: 393/54//48 اس فائل میں انگریزی میں درج کارروائی میں تحریر ہے:

"The Hon'ble the Prime Minister undertook to convey to the Quaid-i-Azam the suggestion that our Independence Day celebrations should be held on the 14th rather than 15th August."

(معزز وزیرِاعظم نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے کہ وہ قائدِاعظم تک یہ تجویز پہنچائیں کہ ہماری یومِ آزادی کی تقریبات 15/اگست کے بجائے 14/اگست کو منائی جایا کریں۔)

اس فائل میں یہ تحریر نہیں کہ اس تجویز کا محرک کون تھا اور یومِ آزادی کی تقریبات 15/ کی بجائے 14/ اگست کو منائے جانے کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے۔ کارروائی کے آخر میں بریکٹ میں تحریر ہے: "Quaid-i-Azam approved the suggestion." (قائدِاعظم نے تجویز کو منظور کرلیا)۔

فائل آگے چلتی ہے اور اگلے صفحات پر کیس نمبر 54/CM/48 مؤرخہ 12/ جولائی 1948ء کے تحت کابینہ کے ڈپٹی سیکریٹری ایس عثمان علی کے دستخطوں کے ساتھ تحریر ہے کہ انھیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ وزیرِاعظم کی زیرِصدارت 29/ جون 1948ء کو منعقد ہونے والی کابینہ میٹنگ کے فیصلے سے تمام وزرا اور اُن کی وزارت کے متعلقہ سیکریٹریوں کو آگاہ کردیں، تاکہ اس فیصلے پر عمل درآمد ممکن بنایا جاسکے۔

فائل میں اگلے حکم نامے کا نمبر 15/2/48 ہے، جو 13/ جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔ اس حکم نامے پر حکومتِ پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری احمد علی کے دستخط ہیں۔ حکم نامے میں کہا گیا تھا کہ: ''ملک کے پہلے یومِ آزادی کی تقریبات 14/ اگست 1948ء کو منائی جائیں گی۔ اس دن ملک بھر میں عام تعطیل ہوگی اور تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں پر قومی پرچم لہرائے جائیں گے''۔ اسی تسلسل میں ایک حکم نامہ اَور بھی ہے، جس پر حکومتِ پاکستان کے اسسٹنٹ سیکریٹری محمد مختار کے دستخط ہیں۔ اس حکم نامے کا نمبر بھی 15/2/48 ہے اور اس میں بھی وہی حکم دہرایا گیا ہے، جو ماسبق حکم نامے میں درج تھا۔ اس حکم نامے میں جو بات اضافی تھی، وہ یہ تھی کہ اس فیصلے سے حکومتِ پاکستان کی تمام وزارتوں، تمام ڈویژنوں، کیبنٹ سیکریٹری، دستور ساز اسمبلی، قائدِاعظم کے پرائیویٹ اور ملٹری سیکریٹری، اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان ریونیوز، آڈیٹر جنرل آف پاکستان اور بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو مطلع کردیا جائے۔ فائل میں محفوظ اگلا حکم نامہ 14/ جولائی 1948ء کو جاری ہوا اور اس کا ڈی او نمبر ہے: 390/CB/48۔ اس میں ایس (شجاعت) عثمان علی نے (ڈپٹی سیکریٹری ٹو دی کیبنٹ) نے وزارتِ داخلہ کے ڈپٹی سیکریٹری خان بہادر سید احمد علی کو مخاطب کیا ہے اور انھیں مطلع کیا ہے۔

> (ترجمہ): ''آپ نے چند روز قبل کابینہ کے اس فیصلے کے بارے میں کہ پاکستان کی یومِ آزادی کی تقریب 14/ اگست کو منائی جائے گی، دریافت کیا تھا کہ کیا یہ فیصلہ صرف اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے۔ میں آپ کو بالصراحت بتانا اور تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف اس سال، بلکہ آئندہ ہمیشہ یہ تقریب 14/ اگست کو منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر متعلقہ شخص کو اس فیصلے سے مطلع فرماویں گے۔''

کابینہ کے اس فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور ملک بھر میں پاکستان کے پہلے یومِ آزادی کی تقریبات 14/ اگست 1948ء کو منائی گئیں۔ تاہم روزنامہ ڈان نے یومِ آزادی کے حوالے سے اپنا پہلا سال نامہ جو 100 صفحات کے خصوصی ضمیمے کی صورت میں شائع کیا تھا، 14/ کے بجائے 15/ اگست 1948ء ہی کو شائع کیا (شاید اس کا ایک سبب یہ ہوا کہ اس سال 15/ اگست کو اتوار کا دن تھا اور یہ دن کسی اخباری ضمیمے کی اشاعت کے لیے نہایت موزوں تھا)۔

نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر میں ایک فائل 360/CF/48 بھی محفوظ ہے، جس میں 1949ء میں منائی جانے والی سالانہ تعطیلات کی تفصیل درج ہے۔ اس فائل کے مطابق 1949ء میں یومِ پاکستان کی چھٹی 14/ اگست 1949ء کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا

تھا۔ اس برس روزنامہ ڈان نے بھی 92 صفحات پر مشتمل اپنا خصوصی ضمیمہ 15/ کے بجائے 14/اگست 1949ء کو شائع کیا تھا۔

پاکستان کے یومِ آزادی کی تقریبات 15/اگست کی بجائے 14/اگست کو منانے کا یہ دستور آج تک جاری ہے۔ اور یوں آہستہ آہستہ بات راسخ ہوگئی کہ پاکستان 15/اگست 1947ء کو نہیں، بلکہ 14/اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔ حال آں کہ محولہ بالا دستاویزات کے مطالعے سے یہ بات بڑی حد تک طے ہوجاتی ہے کہ پاکستان کی پہلی کابینہ نے پاکستان کی تاریخِ آزادی تبدیل نہیں کی تھی، بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال پاکستان کے یومِ آزادی کی تقریبات 15/کی بجائے 14/اگست کو منایا جایا کریں گی اور قائدِاعظم نے بھی اسی فیصلے کی توثیق کی تھی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری اس تحقیق اور فیچر کی اشاعت کے باوجود پاکستان کے یومِ آزادی کی تاریخ میں سرکاری طور پر کوئی فرق نہیں آئے گا، مگر یہ حقیقت نہ جھٹلائی جاسکتی ہے اور نہ اِسے تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا یومِ آزادی 15/اگست 1947ء ہے۔ اس دن جمعۃ الوداع تھا اور اسلامی تاریخ ۲۷/رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ تھی۔ اپنا یومِ آزادی 15/اگست 1947ء کے بجائے 14/اگست 1947ء قرار دینے سے نہ صرف ہم اپنے یومِ آزادی کی تاریخ بدلنے کے مرتکب ہوتے ہیں، بلکہ جمعۃ الوداع اور ۲۷/رمضان المبارک کے اعزاز سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں حسبِ ذیل مضامین، کتب اور دستاویزات سے مدد لی گئی ہے:

1۔ دی ٹرانسفر آف پاور۔ جلد:12۔ ہر میجسٹی اسٹیشنری آفس، لندن۔

2۔ جناح پیپرز، مدیرِاعلیٰ ڈاکٹر زوار حسین زیدی، تلخیص و ترجمہ سید نصرت اللہ شاہ، قائدِاعظم پیپرز پروجیکٹ، کیبنٹ ڈویژن، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد، جلد سوم۔

3۔ قائدِاعظم محمد علی جناح، روز و شب کا تاریخ وار اشاریہ، تدوین ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ترجمہ: خواجہ رضی حیدر، قائدِاعظم اکادمی، کراچی۔

4۔ پاکستان کا تاریخی انسائیکلو پیڈیا، زاہد حسین انجم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

5۔ پاکستان کرونیکل، عقیل عباس جعفری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی۔

6۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور، 15/جولائی 1947ء تا 15/اگست 1947ء کے شمارے۔

7۔ روزنامہ ڈان، کراچی، 15/اگست 1947ء۔

8۔ روزنامہ ڈان، کراچی، 15/اگست 1948ء۔

9۔ روزنامہ ڈان، کراچی، 14/اگست 1949ء۔

10۔ مضمون: یومِ آزادی: جمعۃ المبارک 27/رمضان یا 15/اگست۔ ضیاء الدین لاہوری، مشمولہ جریدہ 36 (غیر مطبوعہ کتابیں نمبر) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

11۔ خفیہ فائل نمبر 360/CF/48، نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کابینہ ڈویژن، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔

12۔ خفیہ فائل نمبر 196/CF/48، نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کابینہ ڈویژن، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد۔

(ماخوذ: سنڈے میگزین؛ روزنامہ ایکسپریس، اشاعت: 14/اگست 2011ء)

www.rahimia.org

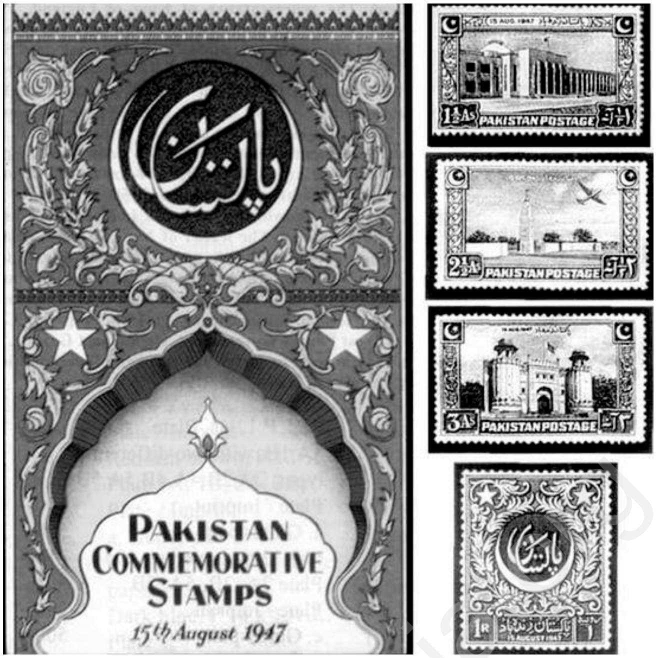

پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ اور فولڈر جن پر پاکستان کا یومِ آزادی 15راگست 1947ء طبع ہوا تھا۔

No.15/2/48-PUBLIC;
GOVERNMENT OF PAKISTAN,
MINISTRY OF THE INTERIOR,
(HOME DIVISION).

Karachi, the 13th.July, 1948.

OFFICE MEMORANDUM.

Subject:-Holiday on the 14th August, 1948.

The undersigned is directed to say that it has been decided that the 14th August 1948, the day on which the first anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, should be observed as a closed holiday throughout the Dominion of Pakistan, and the event should be celebrated by flying Pakistan flags on all public buildings.

(2. It is requested that arrangements may be made to ensure that the Pakistan Flags are flown on all Government buildings on this occasion.)

((A copy of the Home Division notification No.15/2/48-Public, dated the 13th July, 1948, is forwarded herewith for information)).

Mohd. M. Mukhtar.

(Mohd. Mukhtar)
Assistant Secretary to the Government of Pakistan.

P.T.O.

محمد مختار، اسسٹنٹ سیکرٹری حکومتِ پاکستان کا جاری کردہ حکم نامہ

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

October - December, 2019 Vol.11 Issue,4 Regd.370-S

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org

info@rahimia.org /rahimiainstitute